ڈسمبر ۶

نگار

یاد رکھئے — آئندہ ماہ جنوری کا "نگار" ہاتھ سے دینے کی چیز نہیں

خاص خاص مقالے :—

مکمل ڈرامہ "اصحاب کہف"

"خلافت و امامت" شیعی نقطۂ نظر سے

"سائنس کے جدید انکشافات"

نرخنامۂ اُجرت اشتہار

	ایک سال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۱۰۰ روپیہ	۵۰ روپیہ	۲۵ روپیہ	۱۰ روپیہ
آدھ صفحہ	۵۰ "	۲۵ "	۱۳ "	۸ روپیہ
چوتھائی صفحہ	۲۵ "	۱۳ "	۷ "	۴ روپیہ

۱- اُجرت بہرحال پیشگی لی جائیگی۔ ووچر یا وی۔ پی کے ذریعہ سے وصولی منظور نہیں

۲- جتنی مدت کے لئے اشتہار دیا جانا طے ہوا ہے اُس کی رقم پیشگی یکمشت لی جائے گی۔ ماہانہ ادائی کی صورت میں نرخ وہی ماہانہ رہیگا۔

۳- اشتہار فراہم کرنے والی کمپنیوں کا کمیشن ذریعہ خط و کتابت طے ہو سکتا ہے

منیجر "نگار" لکھنؤ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر ..... پانچ روپیہ

ششماہی ہندوستان کے اندر ... تین روپیہ

سالانہ بیرون ہند ..... بارہ شلنگ

ششماہی بیرون ہند ..... ۷ شلنگ

نوٹ:- رسالہ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے

۲۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے ورنہ بعد کو آٹھ آنہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی۔

حصول جواب کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے۔

"منیجر"

تصانیف نیاز فتحپوری

مجموعۂ استفسار و جواب در دو جلد

ان دونوں جلدوں میں سنہ ۲۲ء سے لیکر سنہ ۲۹ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان دونوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسائل شامل ہیں۔

قیمت:- جلد اول ۳ے
جلد دوم ۳ے
علاوہ محصول۔

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے۔

جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فنِ انشا میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں معہ تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول۔

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دلکش مجموعہ۔ جس میں ۳۲- افسانے سنہ ۳۳ء تک کے درج ہیں زبان قدرت بیان اعلیٰ تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی آپکو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیمت چار روپیہ (للعہ)
علاوہ محصول۔

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخ و نفسانی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی۔ نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد دی۔ اس کتاب میں آپکو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

قیمت تین روپیہ (سے)
علاوہ محصول۔

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہو جاتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہیے ورنہ رسالہ منت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (۵) ششماہی تین روپیہ (۳/)
بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ (۱۲/) سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد (۳۰)	فہرست مضامین دسمبر ۱۹۳۶ء	شمار (۶)

ملاحظات ——— ۲
قسم پر ایک تاریخی نظر ——— کاظمی جیراجپوری ——— ۹
بڑے دن کا درخت اور ایک شادی ——— ۱۷
جاپان اور تحریک حزب العمال ——— عبدالرحیم شبلی ——— ۲۴
حروب صلیبیہ کی تاریخ کا ایک گمشدہ ورق ——— ۲۸
سوئٹزرلینڈ کا دفاقی آئین ——— ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری بار ایٹ لا ——— ۳۲
متمدن دنیا کے غیر متمدن انسان ——— اختر انصاری بی۔ اے ——— ۳۷
موت کا انتظار ——— ۴۰
باب الاستفسار ——— ۴۲
مزار سودا کی ایک گمشدہ مثنوی ——— مشیر احمد علوی بی۔ اے ——— ۵۲
مطبوعات موصولہ ——— ۶۳
حیات بعد الموت ——— (پروفیسر) محمود علی (رندھیر کالج) ——— ۶۸
بقیہ ملاحظات ——— ۷۷

نگار

اڈیٹر:— نیاز فتحپوری

جلد (۳۰)	دسمبر ۳۶ء	شمار (۶)

ملاحظات

مسئلۂ فلسطین اور ہندوستان

آپ اسوقت ہندوستان کے کسی مسلمان سے دریافت کیجئے کہ اسے اہل فلسطین کی بے چینی سے کیوں تکلیف ہے تو وہ اس کا جواب یہ دیگا کہ اہلِ فلسطین چونکہ مسلمان ہیں اس لئے اُن کے مصائب سے متاثر ہونا ہمارا مذہبی فرض ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس جواب میں بہت کچھ صداقت پائی جاتی ہے اور بہ حیثیت ہم مذہب ہونے کے ہر مسلمان کے دل میں قدرتاً اس تکلیف کا احساس ہونا چاہئے۔ لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم اخوت مذہبی کے اس رشتہ کو نظر انداز کر دیں تو کیا ہندوستان کی آبادی کا اس سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا اور کیا اس صورت میں یہاں کے باشندوں کے لئے تاثر کی کوئی وجہ نہیں پائی جاتی۔ ممکن ہے بعض ناواقف حضرات اس کا جواب نفی میں دیں، لیکن وہ لوگ جنھوں نے یوروپ کی سیاسیات اور برطانیہ کی ڈپلومیسی کا کچھ بھی مطالعہ کیا ہے، ان سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ جس چیز کو اسوقت مسئلۂ فلسطین سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ دراصل ہندوستان کی

غلامی کا مسئلہ ہے اور اس لئے مسلمان اور ہندو دونوں کو اس سے برابر کا تعلق رکھنا ضروری ہے۔ بظاہر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ اہل فلسطین کی کامیابی و ناکامی کا اثر ہندوستان کی سیاسیات پر کیونکر پڑ سکتا ہے لیکن آیئے آج کی صحبت میں ہم اسی مسئلہ پر ذرا غور کر کے دیکھیں کہ حقیقت کیا ہے۔ قبل اس کے کہ اس گتھی تک پہونچنے کی کوشش کریں ضروری ہے کہ مختصراً دول یوروپ کے موجودہ سیاسی تعلقات اور انکے توازنِ قوت کے مسئلہ کو سمجھ لیا جائے۔

یوروپ میں اسوقت جتنی حکومتیں پائی جاتی ہیں وہ حقیقتاً سب قدیم سلطنت رومہ کے اجزاء منتشر ہیں اور اس لئے ان سے زیادہ کسی کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ وہ باہم متحد ہو کر اس آسمانی بادشاہت کو دنیا میں قائم کر دکھائیں جس میں سوائے امن و سکون اور ابدی راحت کے کسی اور چیز کا درخور ممکن ہی نہیں ہے۔ لیکن کسقدر عجیب بات ہے کہ یہ خواب آج تک پورا نہیں ہوا اور نہ آیندہ اس کی کوئی توقع کیجا سکتی ہے۔

آٹھویں صدی میں شارلمین نے انتہائی کوشش کی کہ وہ کسی طرح یوروپ کی تمام حکومتوں کو ایک جھنڈے کے نیچے لاکر نہایت وسیع عیسوی حکومت کی بنیاد قایم کرے لیکن کامیاب نہ ہوا، سولہویں صدی میں چارلس پنجم نے اپنی تمام قوت اسی مقصد کی تکمیل کے لئے صرف کر دی مگر ناکام رہا، اس کے ڈیڑھ صدی بعد لوئس چہاردہم نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ تمام دول یوروپ ایک پرچم کے نیچے جمع ہو جائیں لیکن یہ حسرت وہ اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ پھر انیسویں صدی میں نپولین نے سلطنت رومہ کے ان منتشر اجزاء کو ایک ہی رشتہ سے وابستہ کرنے کی جتنی کوششیں کیں وہ بھی کسی سے مخفی نہیں، لیکن جب جنگ واٹرلو میں اس کی آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ خواب سے زیادہ حقیقت نہ رکھتا تھا۔ خیر یہ مساعی تو اس قسم کے تھے جن کا تعلق عسکریت سے تھا، اور ایک کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ یہ سب شخصی و انفرادی استیلاء کے بہانے تھے لیکن آپ اس کو کیا کہیں گے کہ اس اتحاد کے لئے صرف عسکریت ہی سے کام نہیں لیا گیا بلکہ قرابت ازدواج پیدا کر کے ایک حکمراں خاندان کا خون بھی دوسرے حکمراں خاندان میں منتقل کیا گیا اور اس طرح یوروپ کی تمام سلطنتوں کا تعلق ایک دوسرے سے گوشت و ناخن کا سا تعلق ہو گیا لیکن پھر بھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب (۱۹۱۴ء میں) سب سے بڑی جنگ شروع ہوئی تو متخاصمین وہی تھے جو باہم دگر سب سے زیادہ تعلقِ قرابت رکھنے والے تھے۔

اس سے مقصود یہ ظاہر کرنا تھا کہ دول یوروپ کی باہمی رقابت کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ یہ مرض اتنا مزمن ہو گیا ہے کہ جب تک براعظم ایشیا یا یوروپ میں سے کوئی ایک بالکل فنا نہ ہو جائے اس کا علاج ممکن نہیں۔ پھر چونکہ اس رقابت کا تعلق صرف جذبۂ تفوق سے ہے اس لئے ظاہر ہے کہ جو حکومت جتنی وسیع ہو گی اتنی ہی زیادہ فکر اُسے دوسری سلطنتوں کے دبانے کی ہو گی اور بحث کا یہی وہ پہلو ہے جو تمام دول یوروپ میں

انگلستان کو ہمارے زاویۂ نگاہ سے قریب تر کر دیتا ہے۔

تاریخ کے طالب علم سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ انگلستان کی اہمیت کا آغاز ۱۵۸۸ء سے ہوتا ہے جب ملکۂ الزبتھ کے زمانہ میں اسپین کے ناقابل تسخیر بحری بیڑے (آرمڈا) کو انگلستان کی بحری کشتیوں نے تباہ کر کے اور فلپ ثانی شاہنشاہ ہسپانیہ کی عظیم الشان قوت کو ہمیشہ کے لئے فنا کر دیا۔

پھر چونکہ تفوق و استیلا کا نشہ ایسا نہیں جو ایک بار چڑھ کر آسانی سے اُتر جائے اس لئے انگلستان نے اپنی اس بحری سیادت کو قائم رکھنے کے لئے جو کچھ کیا وہ بھی کوئی پوشیدہ امر نہیں ہے۔ ۱۶۸۹ء میں فرانس کے خلاف انگلستان کا اعلان جنگ کرنا بھی اسی غرض سے تھا اور تقریباً ایک صدی کی کوشش کے بعد شمالی امریکہ اور ہندوستان سے فرانس کو نکال باہر کرنا بھی اسی جذبہ کا کرشمہ تھا۔ اس کے بعد نپولین کے خلاف انگلستان نے جس تدبیر سے کام لیا وہ بھی سب پر روشن ہے اور واٹرلو کے میدان میں کارسکا کے اس محارب اعظم کا جو حشر ہوا وہ بھی انگلستان ہی کی سیاسی چالوں کا نتیجہ تھا۔

برطانیہ کی سیاست خارجہ کا نقطۂ نظر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ دول یورپ کی قوت میں ایک خاص قسم کا توازن ایسا پیدا کرے جو اس کی سیادت و برتری کو قایم رکھنے والا ہو۔ چنانچہ جب اس نے کسی خاص حکومت کو زیادہ قوی ہوتے ہوئے دیکھا تو اس نے اس کی دشمن حکومت کا ساتھ دیکر اس توازن کو برابر قائم رکھا۔ آج اگر پروشیا سے ہمدردی ہے تو کل فرانس سے اور پرسوں آسٹریا سے، یہاں تک کہ انیسویں صدی میں دو بار غریب ترکوں کے سامنے بھی دستِ اتحاد و اخوت پھیلایا گیا جس کی غرض صرف یہ تھی کہ روس کا درخور قسطنطنیہ میں نہ ہو سکے۔ اور ۱۹۰۲ء میں جاپان کے ساتھ معاہدۂ دوستی بھی محض اسی لئے کیا گیا کہ زار روس کا اثر مشرق بعید میں قائم نہ ہونے پائے۔

یہی وہ پالیسی تھی جس نے ۱۹۱۴ء میں انگلستان کو جرمنی کے خلاف صف آرائی پر آمادہ کیا اور اب بھی وہی پالیسی ہے جو کمزور جرمنی کے ساتھ ہمدردی پر اسے مایل کر رہی ہے۔ الغرض حکومت برطانیہ کی یہ پالیسی بہت مشہور چیز ہے اور سچ پوچھئے تو یہ نتیجہ ہے اس کی جغرافی خصوصیات کا۔

برطانیہ ایک جزیرہ ہے اور براعظم یورپ سے اُسے پانی کا صرف ایک تنگ حصہ علٰحدہ کرتا ہے، یعنی باوجود چاروں طرف پانی سے محصور ہونے کے اس کا تعلق تمام دوسری سلطنتوں سے باقی رہتا ہے اور اس لئے اگر وہ اپنی بحری قوت کو پڑوس کی دو سلطنتوں کے برابر نہ رکھے تو اس کی بقا محال ہے۔ اس کی سلامتی اسی میں ہے کہ وہ وقت ضرورت دشمن کے جہازوں کو پانی کے اُن تنگ راستوں سے نہ گزرنے دے جو اس کے ساحل کے نیچے واقع ہیں اور خود وہ آزادی سے جہاں جی میں آئے اپنے بیڑوں کو لیجائے۔

اب سے قبل جب فن جہازرانی نے زیادہ ترقی نہیں کی تھی اور صرف ہواؤں کے سہارے پر بحری سفر کئے جاتے تھے، اسوقت تک تو خیر برطانیہ کو زیادہ اندیشہ نہ تھا لیکن بعد کو اس فن کی ترقی نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اپنی آزادی قایم رکھنے کے لئے آس پاس کی کمزور سلطنتوں کی آزادی کو بھی قایم رہنے دے۔ چنانچہ سولھویں صدی میں ہسپانیہ سے اس کا برسرپیکار ہونا، انیسویں صدی میں نپولین کے خلاف اس کا جنگ کرنا اور اب بیسویں صدی میں جرمنی کے مقابلہ میں آجانا اسی بنا پر تھا۔ عہدنامۂ لوکارنو میں جرمنی اور دوسری حکومتوں کی سرحد کو متعین کرکے اس کی حفاظت پر زور دینا صرف اسی لئے تھا کہ برطانیہ اپنے تفوق کو قایم رکھنا چاہتا ہے اور اس کی بہترین صورت یہی ہے کہ مغرب میں امن قایم رہے۔

انگلستان کی تاریخ میں بعض زمانے ایسے بھی آئے ہیں جن میں اس نے یوروپ کے معاملات سے بالکل بے تعلقی چھوڑ دی اور سب سے بے نیاز ہوکر ایک آزاد پالیسی قایم کی، لیکن یہ تدبیر کچھ زیادہ چلی نہیں اور آخرکار وہ مجبور ہوگیا کہ پھر اسی طوفان میں اپنے آپ کو ڈالدے، لیکن اس ہنگامہ میں حصہ لینے کے معنے اس نے یہ قطعاً نہیں دئے کہ وہ کسی سے خواہ مخواہ جنگ کرے بلکہ صرف یہ کہ جب کوئی خطرہ اس قسم کا یوروپ میں پیدا ہو تو وہ اپنے وزن سے ترازو کے دونوں پلڑے برابر کردے اور جنگ کے امکان کو درجۂ صفر تک ضعیف بنادے۔

یہاں تک تو مختصراً برطانیہ کی اس سیاست کا ذکر ہوا جو مغرب اور مغربی ممالک سے متعلق تھی، لیکن اس سے ہٹکر اس کی پالیسی کا انحصار بہت کچھ اسکی ان مقبوضات پر ہے جن کو "سمندر پار" کی اصطلاح سے یاد کیا جاتا ہے اور جن میں سب سے نمایاں درجہ ہندوستان کو حاصل ہے۔ مصر میں اس کا پنجہ جمادینا، سوڈان پر قبضہ کرلینا، جبل الطارق اور عدن کے استحکامات پر بیدریغ روپیہ صرف کرتے رہنا، نہر سویز پر اپنا اقتدار قائم رکھنا، اور بحر روم میں کسی اور ملک کے درخور کو گوارا نہ کرنا، یہ تمام باتیں صرف اس لئے ہیں کہ کسی طرح ہندوستان ہاتھ سے نہ نکل جائے اور ضرورت کے وقت وہاں جلد سے جلد فوجیں پہونچائی جاسکیں۔ پھر ایک سال قبل تک تو واقعی حالات ایسے ہی تھے کہ برطانیہ کی ان تمام تدابیر کو بڑی زبردست سیاسی اہمیت حاصل تھی اور بحر روم میں برطانیہ بیڑے کی قوت کو اتنا زبردست تسلیم کیا جاتا تھا کہ یوروپ کی تمام متحدہ بحری قوت بھی اس سے عہدہ برآ نہ ہوسکتی تھی، لیکن اب اطالیہ وحبش کی جنگ نے برطانیہ کے اس بھرم کو بالکل خاک میں ملادیا ہے اور تمام ماہرین کی متفقہ رائے ہے کہ اگر برطانیہ اس جنگ میں حبش کا ساتھ دیتا تو وہ بحر روم کے اقتدار کو بالکل اپنے ہاتھ سے کھودیتا اور یہی وجہ تھی کہ اطالیہ کی بار بار مبارزطلبی کے باوجود برطانیہ کو سامنے آنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اور اسی حقیقت کا احساس تھا کہ ملک معظم کی گورنمنٹ نے برطانیہ بیڑے کو اور زیادہ قوی بنانے کا ارادہ کرلیا ہے تاکہ اگر دوبارہ ایسی ہی صورت پیش آئے جیسی جنگ اطالیہ وحبش کے وقت پیش آئی تو اس کو بغلیں

نہ جھانکنا پڑیں۔

یہ حقیقت مخفی نہیں کہ انگلستان کی بقا ایک قوم کی حیثیت سے منحصر ہے صرف اس امر پر کہ وہ بحری راستوں کو اپنے لئے کھلا ہوا دیکھے، کیونکہ اول تو ایک جزیرہ ہونے کے لحاظ سے اس کا پوزیشن یہ ہے کہ اگر چھ ہفتے محاصرہ کرکے رسد رسانی کو مسدود کردیا جائے تو وہ چھ ہفتہ کے بعد فاقہ کرنے لگے اور دوسرے یہ کہ اس کی تمام صنعتیں اُس خام پیداوار کی برآمد پر منحصر ہیں جو اس کو اپنی مقبوضات و مستعمرات سے حاصل ہوتی رہتی ہیں۔

اب آپ نقشہ اُٹھا کر بحری راستوں پر نگاہ ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ لندن سے بمبئی کا فاصلہ بحر روم اور نہر سویز ہوتے ہوئے ۶۲۶۰ میل ہے لیکن اگر یہ راستہ بند ہوجائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ انگلستان کے جہازوں کو تقریباً دوچند مسافت طے کرنا پڑے گی۔ اب حبش کے نقشہ کو دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حال کی جنگ میں جو حصہ حبش کا اس کے قبضہ میں آیا ہے وہ اتنا ہے کہ مستعمرات اریٹریا اور سومالی لینڈ کو وہ بہت کچھ اسکی مدد سے ترقی دیسکتا ہے۔

اریٹریا بحر احمر کے ساحل پر واقع ہے اور سومالی لینڈ بحر ہند کے ساحل پر اور یہ دونوں مقام ایسے بنجر خشک اور گرم ہیں کہ نہ اطالیہ وہاں اپنی فوج رکھ سکتا ہے اور نہ انھیں اپنی ہوائی قوت کا مرکز بنا سکتا ہے۔ لیکن اب سرزمین حبش پر قابض ہونے کے بعد حالات بالکل بدل گئے ہیں اور اطالیہ آسانی سے ان دونوں مقامات کو اتنا مستحکم بنا سکتا ہے کہ جب چاہے وہ اس آبنائے سے دشمن کو نہ گزرنے دے۔

اب فرض کیجئے کہ کسی وقت برطانیہ کے سامنے ہندوستان کی حفاظت کا سوال آتا ہے تو وہ کیا کریگا۔ اس میں شک نہیں کہ سنگاپور کو بحری قوت کا زبردست مرکز بنا دیا گیا ہے لیکن پھر بھی وہ مجبور ہوگا کہ نہ صرف اپنے جنگی جہاز بلکہ بری فوج بھی جلد سے جلد ہندوستان پہونچائے۔ پھر اگر اطالیہ انگلستان کے دشمن سے ملکر بحر احمر کا راستہ بند کردے (جس کا قوی گمان ہے) تو برطانیہ مجبور ہوگا کہ وہ دوچند مسافت طے کرکے کیپ ٹاؤن کے راستہ سے اپنی فوجوں کو لیجائے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ کوئی بروقت مدد ہندوستانی محاذ پر نہیں پہونچا سکتا۔

اس خطرہ کے دفع کرنے کے لئے جو تدابیر انگلستان اختیار کر رہا ہے ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ وہ اپنی ہوائی قوت کو بڑھا رہا ہے، چنانچہ یہ فیصلہ ہوچکا ہے کہ آیندہ مارچ تک ہوائی جہازوں کی تعداد ۱۱۱۸ سے ۵۶۰۰ تک پہونچا دیجائے گی اور ایک ہزار ہوائی جہاز معہ ایک زبردست ملیشیا کے جنوبی افریقہ کے لئے وقف ہوں گے۔ دوسری تدبیر یہ ہے کہ کیپ ٹاؤن کو سنگاپور سے زیادہ وسیع پیمانے پر بحری مرکز بنایا جا رہا ہے اور تیسری تجویز یہ ہے کہ انگلستان اور ہندوستان کو سرزمین عرب کی راہ سے بھی ایک دوسرے سے قریب تر کردیا جائے

اور یہی وہ چیز ہے جس نے فلسطین کے مسئلہ کو خالص ہندوستانی مسئلہ بنا دیا ہے۔

فلسطین و عراق ہر چند بظاہر انگلستان کی ماموریت میں ہیں لیکن اگر انھیں اسکے مقبوضات میں شامل کیا جائے تو غلط نہ ہوگا کیونکہ عراق کی آزادی بھی ویسی ہی ہے جیسی منچوکو کی کہ نہ یہاں بغیر جاپان کے استرضاء کے کچھ ہو سکتا ہے نہ وہاں بغیر برطانیہ کے اشارہ کے کوئی قدم اُٹھا سکتا ہے تمام وہ معاہدے جو عراق کی برائے نام آزادی قایم رکھنے کے لئے کئے تھے وہ سب پس پشت ڈالدئے گئے ہیں اور لیگ اقوام جس کے حضور میں ان عہد شکنیوں کے خلاف احتجاج کیا جا سکتا تھا اس کی بیچارگی بھی سب پر روشن ہے۔ وہاں کے چشمہ ہائے پٹرول اور دوسری تجارتی سرگرمیوں میں برطانیہ نے اتنی زبردست دولت کا داؤں لگایا ہے کہ وہ اسکو کسی طرح چھوڑ نہیں سکتا۔ لندن سے ہندوستان تک جو ہوائی راستہ قایم ہوا ہے اس کا ایک بڑا مہتم بالشان اسٹیشن عراق ہی میں قایم کیا گیا ہے اور وہاں کے عسکری نظام کی باگ بھی برطانیہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اسی طرح اُس نے ایک نیا مختصر راستہ برطانیہ نے ایسا پیدا کر لیا ہے جہاں نہ اطالیہ کی دسترس ممکن ہے نہ کسی اور مخالف حکومت کی۔ لیکن اس دودھ میں ایک مکھی ضرور نظر آتی ہے جس کا نام فلسطین ہے اور اب برطانیہ اُسی کو دور کرنا چاہتا ہے۔

جسوقت گزشتہ جنگ شروع ہوئی تو کرنل لارنس نے عربوں سے وعدہ کیا کہ اگر وہ ترکوں کے خلاف انگلستان کی مدد کریں گے تو ان کو اپنی آزاد حکومت قایم کرنے میں پوری مدد دیجائے گی۔ عرب کے لوگ چونکہ فطرتاً بہت آزاد واقع ہوئے ہیں اور ترکوں کی حکومت سے وہ یوں بھی بیزار تھے اس لئے وہ فوراً آمادہ ہو گئے اور ترکوں کے خلاف انگلستان کی جو زبردست مدد انھوں نے کی اس کا حال سب کو معلوم ہے لیکن جب کام نکل گیا تو انگلستان نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا اور کرنل لارنس کو یہ عہد شکنی اتنی ناگوار ہوئی کہ اس نے بہت سے اعزازات سے بھی انکار کر دیا جو اس کو دئے جانے والے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فلسطین و عراق برطانیہ کی ماموریت میں چلے گئے اور شام فرانس کی ماموریت میں، گویا عربوں کی آزادی سراب صحرا بنکر غائب ہو گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ برطانیہ عراق و فلسطین پر اس لئے قبضہ کا متمنی نہیں ہے کہ اس سرزمین سے وہ کوئی بڑا تجارتی فایدہ حاصل کرنا چاہتا ہے بلکہ اس کا مقصود صرف یہ ہے کہ ہندوستان تک فوجیں پہونچانے کا ایک اور مختصر راستہ ہاتھ آجائے اور اس پر اقتدار قایم رکھنے کے ذرایع میں ایک اور ذریعہ کا اضافہ ہو جائے لیکن چونکہ اسی کے ساتھ وہ اس کو بھی اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ فلسطین کی عرب آبادی اس سے خوش نہیں ہے اور اس کو جب موقعہ ملیگا وہ آزادی کی کوشش کرے گی، اس لئے وہ اس فکر میں بھی تھا کہ یہاں کی آبادی میں کسی وفادار عنصر کا اضافہ کیا جائے جو ضرورت کے وقت عربوں کے خلاف اس کی مدد کرے، پھر

حُسن اتفاق دیکھئے کہ اسی زمانہ میں ہٹلر نے یہودیوں کو اپنے ملک سے نکالنا شروع کیا اور برطانیہ نے فوراً انکو دعوت دی کہ وہ فلسطین میں آکر آباد ہو جائیں۔ اس سے ایک مقصود تو یہ ہے کہ ایک آبادی اپنی ہمخیال وہاں بسادی جائے اور دوسرے یہ کہ یہودیوں کی قوم بے انتہا دولتمند، جفاکش، اور صنعت و حرفت کا خاص سلیقہ رکھنے کی وجہ سے برطانیہ کے تجارتی اغراض و مقاصد کے لئے بھی مفید ثابت ہوگی۔

فلسطین کے عربوں نے برطانیہ کی اس پالیسی کو بہت بری نگاہ سے دیکھا اور یہودیوں کی درخور کے خلاف مظاہرہ بغاوت شروع کر دیا۔

۱۳ جولائی کو امیر عبداللہ نے برطانیہ کو لکھا کہ:۔ "اب میں عربوں کے جوش کو فرو نہیں کر سکتا، دو ماہ تک میں نے ان کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی لیکن اگر فلسطین کا مسئلہ جلد طے نہ کیا گیا تو پھر معاملہ میرے ہاتھ سے نکل جائے گا۔" اس کا جواب فلسطین کے ہائی کمشنر نے یہ دیا کہ "حکومت برطانیہ ان مظاہروں سے ڈرنے والی نہیں، اور وہ فلسطین کو اپنا قومی وطن بنانے میں یہودیوں کا ضرور ساتھ دیگی"۔

عربوں کی مخالفت یہودیوں سے چند در چند اسباب کی بناء پر بالکل درست ہے کیونکہ اول تو بہت سی زمینیں جو اسوقت عربوں کے قبضوں میں ہیں یہودیوں کے پاس چلی جائیں گی، دوسرے یہ کہ وہ دولتمند ہونے کی وجہ سے تمام تجارت و حرفت پر قابض ہو جائیں گے، تیسرے یہ کہ زیادہ ترقی یافتہ ہونے کی حیثیت سے انکو نظام حکومت میں درخور کا بہت وسیع موقعہ ہاتھ آئے گا اور اس طرح عربوں کی نہ صرف معاشری و اقتصادی بلکہ سیاسی حیثیت بھی بہت ضعیف ہو جائے گی، چوتھے یہ کہ بیت المقدس پر ان کا اقتدار قائم ہو جانے سے وہاں عربوں کی وہ مذہبی آزادی باقی نہ رہیگی جو اسوقت تک انھیں حاصل ہے اور پانچواں سب سے قوی سبب یہ ہے کہ وہ یہودیوں کی وجہ سے آزادی کی لڑائی کامیابی کے ساتھ جاری نہ رکھ سکیں گے اور طوقِ غلامی ہمیشہ کے لئے ان کی گردن میں پڑ جائے گا۔ یہ تو خیر وہ باتیں ہیں جن کا تعلق بالکل فلسطین اور وہاں کی عرب آبادی سے ہے لیکن نتیجہ کے لحاظ سے یہ مسئلہ اتنا اہم ہے کہ اس کا اثر فلسطین سے گزر کر برطانیہ کے تمام مستعمرات اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان تک پہونچتا ہے اور اگر برطانیہ اس میں کامیاب ہو گیا تو ہندوستان پر برطانیہ کی گرفت بہت زیادہ قوی ہو جائیگی اور آزادی ہند کی راہ میں غیر معمولی مشکلات پیدا ہو جائیں گے ــــ اس لئے فلسطین کا مسئلہ صرف عرب و یہود کی جنگ کا مسئلہ نہیں ہے، محض عربوں کی فلاح و بہبود کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ ہندوستان کی غلامی و آزادی کا مسئلہ ہے اور اسی نقطۂ نظر سے اس کو دیکھنا چاہئے۔ مسلمان اگر اس کو خالص مذہبی چیز قرار دیتے ہیں تو غلطی کرتے ہیں اور ہندو اگر اس کو صرف غیر ملکی سوال قرار دیکر نظر انداز کر رہے ہیں تو وہ بھی راستی پر نہیں ہیں ضرورت ہے کہ ہندو مسلمان سب ملکر اس کے انجام و عواقب پر نظر کریں اور جو کچھ کرنا چاہتے ہیں متفقہ قوت کے ساتھ کریں۔

(باقی ملاحظات کے لئے صفحہ ۷۷ دیکھئے)

قسم پر ایک تاریخی نظر

مذہبی اشارات یا مخصوص اصطلاحات کے ذریعہ سے، مخاطب کو کسی بات کا یقین دلانا "قسم" کہلاتا ہے، عربی لغت میں قسم کو لفظ یمین سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ یمین کے معنے "داہنے ہاتھ" کے ہیں۔ اس کا راز یہ ہے کہ عہدِ عتیق میں انسان باہمی عہد و پیمان کے وقت داہنے ہاتھ کو اپنے حلیف کے ہاتھ پر مارتا تھا۔ لہٰذا اس یمین (داہنے ہاتھ) کے استعمال نے، لوگوں کو اسے یمین ہی کے نام سے پکارنے پر مجبور کر دیا۔ کیونکہ جب وہ اپنے داہنے ہاتھ کو ایک دوسرے سے ملا لیا کرتے تھے تو پھر وعدہ پورا کرنا یقینی اور حتمی ہوا کرتا تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ عہدِ عتیق میں انسان اپنے عہد کو قابلِ اعتبار اور وعدے کو استوار بنانے کے لئے اپنے داہنے ہاتھ کو بوقتِ معاہدہ بلند کر لیا کرتا تھا، لہٰذا اس مناسبت سے قسم کے متعلق یمین کی اصطلاح وضع کر لی گئی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ تاریخ عہدِ عتیق کی ورق گردانی کرنے کے بعد ایک واقعہ بھی اس قسم کا نہیں ملتا کہ انسان نے عہدِ عتیق میں جو یقیناً اُسکی ابتدائے آفرینش کا زمانہ ہے، قسم کا استعمال کیا ہو۔ اس لئے یہ بات زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ قسم سراسر انسان کے دینی اور مذہبی معتقدات کی پیداوار ہے۔

ابتدائے قسم انسان کے دینی معتقدات کے ظہور سے لیکر آج تک یہ عقیدہ ہر نوعِ انسانی کے رگ و ریشہ میں جاری و ساری نظر آتا ہے کہ ــــ قسم کا پورا نہ کرنا، وعدہ خلافی کرنا، یہ وہ بُری چیزیں ہیں جن سے عذاب ہوا کرتی ہیں ــــ اور دراصل یہی عقیدہ قسم کے وجود کا باعث بھی ہے۔ اور آج بھی یہ عقیدہ اکثر غیر متمدن قبائل کے اندر موجود ہے۔ مثلاً باشندگانِ آسام عموماً ایک ایسے نرالے اور عجیب و غریب طریقہ سے قسم کھاتے ہیں کہ اُسے دیکھ کر آپ بہ آسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قسم کے متعلق ان کے معتقدات کیا ہیں۔ وہ قسم کھاتے وقت اپنے حلیف کے روبرو ایک زندہ مرغی پیش کر کے تلوار کی ایک ہی ضرب میں اس کے نصف جثہ کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں "اگر ہم اپنی قسم میں جھوٹے ثابت ہوں تو پھر اس تلوار کو اجازت ہے کہ وہ ہمارے جسموں کے ساتھ بھی یہی برتاؤ روا رکھے!" ــ اور اسی طرح بعض افریقی قبائل کا دستور ہے کہ وہ بوقتِ قسم، قسم کو شوکت کرنے کے لئے شیر کا دانت استعمال کرتے ہیں۔ قسم کھانے والا شیر کے دانت کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے ــ "اگر میں اپنے وعدے کو

پورا نہ کروں تو اس کا شکار ہو جاؤں"۔ ان میں سے اکثر نیزہ، حربہ اور تیر و کمان کو بوقت قسم استعمال کرتے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ عجیب طریقۂ قسم، قبائل آسکیمو کا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ان سب سے کسی شخص کو جب قسم کھانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ ریچھ کے ایک سر کو مجلس، یا اپنے حلیف کے سامنے لیکر کھڑا ہوتا ہے اور اُسے اپنے دانتوں سے نوچتے ہوئے کہتا ہے۔ اگر میں اپنے قول میں سچا ثابت نہ ہوں تو پھر اس ریچھ کو اجازت ہے کہ وہ میرے ساتھ بھی یہی برتاؤ کرے!۔ اسی طرح باشندگانِ سنتال، جو صوبۂ بہار میں واقع ہے، بوقتِ قسم چیتے کے سر یا جلد کا انتظام کرتے ہیں، اور اس کے واسطہ سے قسمیں کھاتے ہیں۔ چیتے کی تخصیص محض اسوجہ سے ہے کہ ہندوستان کے اکثر باشندے، جیسا کہ عام طور سے مشہور ہے، مسئلہ حلول یعنی "آواگون" کے قایل ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ چیتے کے متعلق اُن کے معتقدات دگرگوں ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ ایسا شخص جس نے چیتے کا شکار ہو کر اپنی جان دی ہے، حقیقی طور پر فنا ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ بوقتِ قسم چیتے کے سر اور کھال کو استعمال کر کے قسم کی اہمیت کا اظہار کرتے ہیں۔ جس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ قسم شکنی کرنے والے کے وجود سے روئے زمین ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پاک ہو جائے۔

انسان نے بہت کم چیزیں ایسی چھوڑی ہیں جن کو اُس نے اپنے دائرۂ قسم میں نہ سمیٹا ہو۔ خدا، آسمان دریا، پہاڑ، حیوان، نباتات، شاید ہی ان میں سے کوئی چیز بچی ہو جس کو اُس نے اپنی قسم میں استعمال نہ کیا ہو۔ مصر کے قدیم باشندے سورج اور دریائے نیل کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔ ہندوستان کے اکثر باشندے ابتک دریائے گنگا اور جمنا کی قسمیں کھاتے ہیں۔ اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ قسم شکنی کی صورت میں یہ مقدس دریائیں، قسم کھانے والے کے بال بچوں کو اپنے اندر ڈبو کر انتقام لے لیں گے۔ باشندگانِ تبت کا بھی تقریباً یہی خیال ہے اُن میں سے بھی جب کسی کو قسم کھانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ ایک چھری کے ساتھ منظرِ عام پر آتا ہے، اور سورج کی شعاعوں میں چھری کے پھل کو چمکاتے ہوئے کہتا ہے، — "اگر میں اپنے قسم میں جھوٹا ثابت ہوں تو اس چھری کو اختیار حاصل ہے کہ یہ میرے پیٹ کو چاک کر ڈالے"۔

قسم، مختلف اقوامِ عالم میں بہرحال، ان تمام حالتوں میں قسم کا تعلق صرف دینی معتقدات سے تھا۔ اور یہ اُسی کا کرشمہ ہے کہ انسان نے آہستہ آہستہ ترقی کر کے خدا اور اُسکی پیدا کردہ اشیاء مثلاً آسمان و زمین کی قسمیں کھانی شروع کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ، مقدونیہ و قرطاجہ کے درمیانی معاہدہ کو اس حیثیت سے دکھلاتی ہے کہ اُنھوں نے اس معاہدہ کی صداقت کے لئے یونان کے مسلمہ خداؤں کے خدا، "ترنس" اور سب سے بڑے خدا "ہیر" و "ایولون" اور اسی طرح اپنے یہاں کے سارے خداؤں کی قسم کو نہایت موکد طریقہ سے پیش کیا تھا۔ رومیوں کے یہاں بھی یہ طریقہ موجود تھا۔ وہ اپنے

خداؤں کی قسمیں اس یقین و ایمان کے ساتھ کھاتے تھے کہ اگر قسم شکنی ہوگئی تو خدا بجلی کی کڑک کے ذریعہ سے قسم توڑنے والے کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردے گا کیونکہ اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ صرف انسان کی عہد شکنی ہی کا یہ کرشمہ ہے کہ آسمانی بجلیاں خدا کے عذاب کی صورت میں ظہور پذیر ہوتی ہیں اور انسانی آبادیوں کو اپنی شعلہ فشانیوں سے جھلس کر خاک سیاہ کردیتی ہیں، اس کے علاوہ اُن کے قسم کھانے کا طریقہ بھی عجیب تھا۔ وہ قسم کھاتے وقت ایک زندہ سور لاتے اور پتھر کی بنی ہوئی چھری سے اُسے ذبح کرتے تھے گویا مدعا یہ ظاہر کرنا تھا کہ عہد شکن بھی اسی برتاؤ کا مستحق ہے۔ لیکن سب سے زیادہ عجیب رویہ، شاید اس بارے میں بعض اُن قدیم قبایل کا ہے جنکے فریقین قسم کھاتے وقت ایک دوسرے کے برابر کھڑے ہوکر ہر ایک کے بدن سے خون کا ایک ایک قطرہ نکالتے ہیں اور اُسے اپنی زبان سے چاٹ کر گویا اسبات کا ثبوت بہم پہونچاتے ہیں کہ اُن کی یہ درمیانی قسمیں ایک دوسرے کے خون کے اندر جاری و ساری ہوگئیں۔ لہذا ان کا اب ٹوٹنا امر محال ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں اہل یورپ اور باشندگان عرب کی یہ عادت تھی کہ وہ تلوار ہاتھ میں لیکر قسمیں کھایا کرتے تھے، اور اس سے مراد اُن کی یہ ہوا کرتی تھی کہ ـــ اگر اپنی قسم کے اندر ہم جھوٹے ثابت ہوں تو پھر ہر شخص کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اسی تلوار سے ہمارا کام تمام کردے ـــ فوجیوں کے اندر ابتک یہ دستور ہے کہ وہ اپنے جذبۂ سپاہیانہ کے اعزاز و تمکنت کے لئے اپنی تلواروں کی قسمیں کھایا کرتے ہیں۔

باشندگان اسکنڈنیویہ کے قدیم قبائل کے اندر یہ دستور تھا کہ اُن کے رہنمایانِ دین فریقین کی ذاتی پرخاش اور درمیانی عداوت کو دور کرنے کے لئے عدالت گاہ میں آتے تھے، جہاں قربانگاہ اور چند دھات کے بنے ہوئے طوق نما مدور کڑوں کا موجود ہونا ضروری ہوتا تھا۔ ان رہنمایانِ دین کے لئے ضروری ہوتا تھا کہ وہ کرسئ قضا پر جلوہ افروز ہونے سے پیشتر ان کڑوں میں سے کم سے کم ایک کو اپنے ہاتھ میں چوڑیوں کی جگہ پہن لیں اس کے بعد اُن کے سامنے ایک بیل، عدالت گاہ کے مذبح میں لاکر ذبح کردیا جاتا تھا۔ مذہبی پیشوا اپنے ہاتھ کو، جس کی کلائی پر کڑا ہوا کرتا تھا، بیل کے خون میں آلودہ کرلیتا، اور پوری عدالت گاہ کو مخاطب کرکے یوں کہتا ـــ میں ساری عدالت گاہ کو مخاطب کرکے اس مقدس کڑے کی قسم کھاتا ہوں کہ میں عدل و انصاف قایم رکھوں گا۔

قسم شکن پر عتاب

مذہب پرست اصحاب کا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ ایسے شخص پر جسے اپنے عہد و قسم کا پاس نہیں ہوتا۔ عتابِ خداوندی نازل ہوتا ہے۔ تاریخ یورپ و اسلام کے اندر تین بدبختوں کے حالات مذکور ہیں، جنھوں نے امام کنیسہ کے سامنے اپنے قول کے سچے ہونے پر قسمیں کھائی تھیں۔ اُن میں سے پہلے شخص نے یہ آرزو ظاہر کی تھی کہ اگر وہ اپنے قول میں خدانخواستہ جھوٹا ثابت ہو تو

آسمان سے بھڑکتے ہوئے شعلوں کے ساتھ آگ نازل ہو اور اس کو جلا کر خاک سیاہ کر دے۔ دوسرے شخص نے کہا کہ وہ عدم ایفائے قسم کی صورت میں کسی وبائے ناگہانی کا شکار ہو جائے اور تیسرے شخص نے عہد شکنی کی صورت میں اپنے اندھے ہو جانے کے متعلق التجا کی۔

ابھی اس واقعہ کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ان بدنصیبوں نے اپنی اپنی قسمیں توڑ دیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آسمان سے آگ کے شعلے بلند ہوئے اور انھوں نے پہلے شخص کے خاندان کے تمام افراد کے ساتھ ساتھ اس کے مکان کو اور خود اس کی ہستی کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا، دوسرے شخص کو، اس کی خواہش کے مطابق، اک بلائے ناگہانی نے آدبوچا۔ اور تیسرا شخص اپنے دونوں ساتھیوں کے حالات کو دیکھ کر حد درجہ خائف ہوا اور اکثر مصروف گریہ و بکار رہنے لگا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس تاثر آمیز گریہ نے، تھوڑی ہی عرصہ کے اندر اس کی دونوں آنکھیں اچک لیں اور وہ اندھا ہو کر رہ گیا۔

مذکورۂ بالا مثال کے اندر اس بات کا کافی ثبوت موجود ہے کہ مذہب پرست اصحاب کے معتقدات میں صرف یہی بات داخل نہیں تھی کہ قسم توڑنے والا عذاب آخرت میں ماخوذ ہوگا۔ بلکہ اُن کا اعتقاد تھا کہ ایسے شخص کو اپنے جرم کی پاداش میں اس دنیا کے اندر بھی سزا بھگتنی پڑے گی، یہ اعتقاد کہ قسم شکنی کا تعلق عذاب بعد الموت سے ہے، محض پیروانِ مذاہب تک محدود نہ تھا، بلکہ اس عقیدے کا پتہ انسان کے قدیم قبایل اور وحشیانہ طرز زندگی میں بھی چلتا ہے، موجودہ دور میں افریقہ کے قدیم وحشی قبائل کی چھان بین کیجئے! اُن کے اندر ابتک آپ کو ان معتقدات کا بڑا حصہ نظر آئے گا اور ساتھ ہی ساتھ اُن کے ایمان متعلق بہ وجود ارواح اور دیوتاؤں کا بھی پتہ چل جائے گا کہ روحیں اور دیوتا قسم توڑ دینے والے سے ناخوش ہو جایا کرتے ہیں، اور اس جرم میں قسم شکن پر عذاب نازل کرتے رہتے ہیں، اور یہ نزولِ عذاب محض اسی حیات تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کا سلسلہ ماورائے قبر تک پہونچتا ہے، اور وعدہ شکن کو وہاں بھی اپنے جرم کی پاداش میں عذاب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

درحقیقت عذاب قبر کا یہ نظریہ، انسان کی زندگی کے اُس دور سے تعلق رکھتا ہے، جبکہ وہ اپنی حیات کے بالکل ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا، ہر چہار جانب سے طبعی طاقتوں کے حملے اس کی جان کیلئے دہشت آزار تھے، گرمی و سردی ہوا کے بے پناہ جھونکے اور بجلیوں کی خوفزدہ کر دینے والی ڈراؤنی کڑک، اس کے علاوہ اور دیگر طبعی طاقتیں، جن کے علل و اسباب اُس کی فہم سے قطعاً بالاتر تھے، آئے دن اُس کے وجود کے لئے باعث آزار بنے رہتے تھے، لہٰذا ان حالات میں اس کے علاوہ انسان کے لئے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا، کہ وہ ان طاقتوں کو ماورائے سرحد ادراک سمجھ کر، یہ خیال کرے کہ یہی

طاقتیں اس کے وجود اور رزق کی ذمہ دار ہیں، اور اُن کو بہرحال یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ انسان کو اس کی غلطیوں اور وعدہ خلافیوں پر سزا دیں۔

قسم کی اہمیت قانون میں

آقانونِ قسطنطین ہمیشہ ایسے اشخاص کے خلاف فیصلہ کرتا جو جھوٹی قسمیں کھانے کے لئے طیار ہو جایا کرتے تھے۔ اسی طرح اُن گواہوں کے متعلق بھی اُس کے فیصلے ہمیشہ خلاف ہوا کرتے تھے، جو محکمۂ قضا کے روبرو ادنیٰ ادنیٰ باتوں پر قسمیں کھانے کے لئے طیار ہو جایا کرتے تھے، لیکن شاہِ قسطنطین — یوستینان — کے دورِ حکومت کے بعد سے قسم کے متعلق قانونِ سلطنتِ قسطنطین کیسر بدل گیا۔ اور فریقین کے لئے یہ بات لازم قرار دیدی گئی کہ وہ عدالت کے روبرو اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لئے اور دوسرے دلائل کی طرح قسم کا بھی استعمال عمل میں لایا کریں، راہبوں اور مذہبی پیشواؤں کے لئے یہ بات واجب قرار دیدی گئی کہ وہ گرجاؤں یا دیگر مجلسوں کے اندر خاص خاص رسموں اور نذر و نیاز کے وقت پبلک سے خلوص عقیدت اور وفاداریٔ مسیح کے متعلق قسمیں لیا کریں۔ لہٰذا اس قانونی اصلاح کا نتیجہ یہ ہوا کہ رہنمایانِ دین نے خاص خاص قسم کی اصطلاحی قسمیں ایجاد کرنا شروع کر دیں اور ابھی زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ریاستِ قسطنطین کے اندر تقریباً ہر گروہ کا طریقۂ قسم، الگ الگ قائم ہو گیا۔ عیسائیوں نے اپنے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ قسم کھاتے وقت اپنے ہاتھوں پر انجیل مقدس کا ایک نسخہ رکھ لیا کرتے تھے اور اس کا بوسہ لینے کے بعد اپنی قسموں کا آغاز کیا کرتے تھے۔ تحقیق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس سے قبل یہودی بھی عرصہ تک اسی طریقہ کو استعمال کر چکے ہیں ہاں! یہودیوں کے طریقۂ قسم میں اختلاف کا پتہ ضرور چلتا ہے کہ وہ توریت مقدس کے نسخہ کو ہر قسم کے وقت ہاتھ میں نہیں رکھتے تھے بلکہ اُن کے یہاں اُس کا ہاتھ میں رکھنا قسم کی اہمیت کے اوپر موقوف تھا، اور اُن کا یہ طریقہ بھی ذاتی نہیں بلکہ رومیوں کے طریقۂ قسم سے ماخوذ تھا۔

رہا عیسائیوں کا وہ طریقہ کہ قسم شروع کرنے سے پیشتر انجیل مقدس کے بوسے لیا کرتے تھے، تو زیادہ خیال یہی ہے کہ اُن کے یہاں ازمنۂ وسطیٰ سے، جو عیسائی دنیا کے لئے انتہائی جہالت اور بربریت کا زمانہ تھا، یہ طریقہ جاری تھا، اُسوقت کا طریقہ یہ تھا کہ گرجے کے اندر قربان گاہ پر انجیل مقدس کا ایک نسخہ رکھدیا جاتا تھا، اور قسم کھانے والا سامنے نہایت مودبانہ طریقہ سے کھڑا ہو کر اُس پر ہاتھ رکھتا، یا اوپر نگاہیں جما کر اپنی قسم کا آغاز کرتا تھا، اور انجیل مقدس بروقت بہم نہ پہونچنے کی صورت میں اُس کے قایم مقام کسی دوسری مقدس چیز کو مثلاً صلیب مقدس وغیرہ کو استعمال کیا جاتا تھا، یہاں اک سوال الفاظ قسم کے متعلق پیدا ہوتا ہے کہ اُن کے اندر اختلاف کیوں ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ قسموں کا رواج

تو ہر جماعتِ انسانی کے اندر پایا جاتا ہے لیکن اختلافِ الفاظ کے ساتھ؟؟۔ محققین کا خیال ہے کہ یہ زمان و مکان یہ آب و ہوا اور جغرافیائی اثر کے اختلاف کا نتیجہ ہے کہ اُس نے قوموں کو حلف، کے لئے مختلف الفاظ استعمال کرنے پر مجبور کر دیا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ حلف کا مقصود ہر جگہ ایک ہی ہے۔

بعض مسیحی ریاستوں کے قوانین کی رو سے قسم کھانے کے لئے مخصوص الفاظ متعین ہیں مثلاً:۔

میں خدائے مطلق کی، خدا کے اکلوتے بیٹے یوسع مسیح کی، روحِ قدس کی، مریم بتول کی، انجیل مقدس کی، جو اسوقت میرے ہاتھ میں ہے، اور تمام فرشتوں کے سردار حضرت جبرئیل و میکائیل کی قسم کھاتا ہوں۔

شاہانِ فرانس ازمنۂ وسطیٰ میں حسب ذیل الفاظ کے ساتھ اپنی قسمیں پوری کیا کرتے تھے ــــ "میں خدا کی محبت، اُمتِ مسیح اور اُن کے اخلاص کی قسم کھاتا ہوں"

اکثر یورپین عیسائی اپنی قسمیں ختم کرتے وقت یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں ــــ "اے خدا! تو میری قسم کے طفیل میں مجھے نیکی کے راستہ پر لگا"

ملوک و حکام کی قسمیں

"ولیم فاتح" کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہمیشہ اس طرح قسم کھاتا تھا:۔
"میں خدا کی عظمت و جبروت کی قسم کھاتا ہوں"

لاچارڈ شیر دل اور شاہ یوحنا ہمیشہ خدا کے قدموں اور دانتوں کی قسمیں کھایا کرتے تھے، اور اکثر مغربی بادشاہوں کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ زیادہ تر "تاج" خدا کے مصنوعی مجسمے اور "موت" کی قسمیں کھایا کرتے تھے، انگلستان کا یہ دستور تھا کہ تاج پوشی کے وقت پوپ اُن سے حکومت اور رعایا کی خیر خواہی کی قسم لیا کرتا اور جلوسِ تاجپوشی کے سامنے کھڑے ہو کر بلند آواز سے بادشاہ کو مخاطب کر کے کہتا:۔

کیا تم تیار ہو! اور قسم کھاتے ہو! کہ برطانیہ کے عام مقبوضات، آئرلینڈ اور کناڈا وغیرہ کی نوآبادیات پر اُنھیں قوانین کے ذریعہ حکومت کرو گے! جن کو پارلیمنٹ نے برطانیہ کے تمام مقبوضات و نوآبادیات کیلئے وضع کئے ہیں؟؟

بادشاہ جواب دیتا ہے ــــ "ہاں! میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ایسا ہی کروں گا"۔ اور یہ طریقہ حکومت برطانیہ کے اندر اب تک جاری ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً تمام شاہانِ ماتحت، حکام، والیانِ ریاست اور وزراء جب اپنے اپنے ملک میں کسی اہم خدمت پر مامور ہوتے ہیں تو اُنھیں بھی حکومتِ وقت کی وفاداری اور جاں نثاری کے لئے قسمیں کھانی پڑتی ہیں۔ خصوصاً غلام ممالک مثلاً ہندوستان وغیرہ میں تو یہ طریقہ اسدرجہ رائج ہے کہ حکومت اہمیت و غیر اہمیت کی بحث نہ کرتے ہوئے ہر چھوٹی بڑی خدمت کے لئے وہاں کے باشندوں سے اپنی وفاداری کے متعلق قسمیں لیا کرتی ہے۔

لیکن یہ دستور تقریباً دنیا کے ہر حصہ میں رائج ہے کہ اُس مجلس کے ممبران کو، جو براہ راست کسی بادشاہ سے متعلق ہوتی ہے، عہدۂ ممبری قبول کرتے وقت حکومتِ وقت اور رعایا دونوں کی وفاداری و خیر خواہی کی قسمیں کھانی پڑتی ہیں، مثلاً مصری پارلیمنٹ کے ممبران عہدۂ ممبری قبول کرتے وقت پورے مجمع کو مخاطب کرکے یوں قسمیں کھاتے ہیں:-

"میں خدائے بزرگ و برتر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اس مجلس کی اور مصری قوم کے قوانین کی حفاظت کروں گا۔"

لیکن انگریزی پارلیمنٹ نے اپنے ممبران کی قسموں سے ایسے شرائط جن کا تعلق براہِ راست عیسائیت سے تھا، اب حذف کر دئے ہیں، تاکہ غیر مسیحی ممبران کو قسم کھاتے وقت کوئی جھجھک نہ محسوس ہو، یا وہ اس قسم کو اپنے عقیدۂ مذہبی کے خلاف سمجھ کر کوئی ناجائز فایدہ اُٹھانے کی کوشش نہ کریں۔

قسم دنیائے مذاہب میں

یہ تو تھی قسم کی وہ حالت جو حکومت، ملوک، حکام اور اقوامِ عالم سے متعلق تھی اب ذرا یہ بھی معلوم کرتے چلئے! کہ دنیائے مذاہب نے اپنے پیروکاروں کے لئے کیا قسمیں ایجاد کیں اور ان کو قائم نہ رکھ سکنے کی صورت میں کیا تعزیریں مقرر کی ہیں۔

اسلام نے اپنے پیروکاروں کے لئے فقط ذات خدا کی قسم مقرر کی ہے اور قسم قایم نہ رکھنے کی صورت میں یہ سزا مقرر کی ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلائے، اور نہیں! تو پھر اُن کی تن پوشی کا انتظام کیا جائے، عیسائیت نے اپنے یہاں طریقۂ قسم یہ رکھا ہے کہ ہر عیسائی کو بوقتِ قسم گرجے میں، قربان گاہ کے سامنے، انجیل مقدس پر ہاتھ رکھ کر، آسمان کی طرف بہت معصومانہ طریقہ سے آنکھیں اُٹھانی پڑتی ہیں، اور قسم قائم نہ رکھنے کی صورت میں، پادری کے پاس گرجے میں جاکر، اقبالِ جرم کے بعد، آیندہ کے لئے بیعت کرنی پڑتی ہے یہودیوں کے یہاں بھی تقریباً یہی صورت ہے، اُنھیں بھی بوقت قسم اپنی الہامی کتاب ساتھ رکھنی پڑتی ہے، اور قسم توڑ دینے کی صورت میں، کفارۂ قسم ادا کرنا پڑتا ہے۔ بودھ مت میں قسم کا طریقہ، براہِ راست بودھ جی سے متعلق ہے، یعنی بوقتِ قسم، مہاتما بودھ جی کے بُت کے سامنے گھٹنے ٹیک کر کھڑا ہونا پڑتا ہے، اور شکستِ قسم کی صورت میں، بتِ مقدس کے سامنے تازے میوے اور مٹھائیوں کی ڈالی چڑھانی پڑتی ہے جن کو پجاری آپس میں تقسیم کر لینے کے بعد یہ حکم سُناتے ہیں کہ اب تم جرمِ قسم شکنی سے بری ہو گئے اور چونکہ اس مذہب کا تعلق ہندوستان، سیام، چین، اور جاپان وغیرہ سے ہے، اس لئے تقریباً ان تمام ممالک میں ہر جگہ یہی طریقۂ قسم رائج ہے۔ ہندو دھرم کے اندر جو ہندوستان کے مختلف مقامات میں رائج ہے، کوئی خاص طریقۂ قسم رائج نہیں، بلکہ وہ دنیا کے ہر کنکر، پتھر، بتی، بندر کو دیوتا تسلیم کرتا ہے اور

اپنے عقیدتمندوں کو ان کے نام پر قسمیں کھانے کی اجازت دیتا ہے۔ قسم شکنی، جہاں تک پتہ چلتا ہے، تقریباً ہر جگہ گناہ سمجھی جاتی ہے، اور قسم توڑنے والا برادری سے اُسوقت تک کے لئے خارج قرار دیدیا جاتا ہے، جب تک کہ وہ پوری برادری کو اپنے گھر پر مدعو کر کے ایک وقت کا کھانا نہ کھلائے۔ زردشتیوں کے یہاں یہ طریقہ تھا کہ قسم کھانے والے کو اپنے مذہب کی قسم کھانی پڑتی تھی۔ اور قسم توڑ دینے کی صورت میں اُسے اسوقت تک کے لئے خارج از مذہب قرار دیدیا جاتا تھا جب تک کہ وہ خود کوئی مذہب کی اہم خدمت انجام دیکر اپنے کو داخلے کا مستحق نہ ثابت کر دے۔ لامذہب والوں کے یہاں یہ دستور ہے کہ انسان کو خود اپنی عزت، شرافت، اور انسانیت کی قسم کھانی پڑتی ہے، لیکن ان کے یہاں قسم توڑنا کوئی گناہ نہیں ہے مگر معیوب ضرور ہے کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ انسان خدا اور رسول پر ایمان رکھتے ہوئے گناہ کرتا اور جرم قسم شکنی میں مبتلا ہو جایا کرتا ہے لیکن یہ ایک بار بھی نہیں دیکھا گیا کہ لامذہبیت کا پرستار، خدا اور رسول پر ایمان نہ رکھنے کی صورت میں ایک بار بھی، کسی انسانی گناہ، یا جرم قسم شکنی میں ماخوذ ہوا ہو!—

(ماخوذ) کافی جیراجپوری

مجموعۂ استفسار و جواب ہر دو جلد

یوں سمجھئے کہ دائرۃ المعارف کی جلدیں ہیں جن کے ۱۰۰۰ صفحات میں علم و ادب تاریخ و مذہب نقد و تبصرہ اور عام معلومات کا ایک بے بہا خزینہ پوشیدہ ہے ان میں تقریباً ۱۰۰ مسائل پر آپ کو وہ مواد ملے گا جو برسوں کی کتب بینی کے بعد بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ چند مباحث کی فہرست ملاحظہ ہو:—

مسئلۂ جبر و اختیار — خواب کی حقیقت — معاد و خلود — طبقۂ نسواں اور غرلگوئی — برج بابل — فاسسٹ جماعت سامری کون تھا — باغ ارم کی حقیقت — فلسفۂ محبت — بھوت پریت — اصحاب کہف — سالویشن آرمی — ہالہ کا سبب — معجزہ و کرامات — فرقۂ معتزلہ — مذہب و عقل — طوفان نوح — یاجوج ماجوج — برہمو سماج — طبقۂ نسواں اور تعلیم — مریخ کی حقیقت — منصور حلاج — چند الفاظ کی تحقیق — اصطلاحات تصوف کا ترجمہ وغیرہ وغیرہ

قیمت ہر دو جلد معہ محصول خریداران نگار سے للیعہ — غیر خریداران سے ۹ر

منیجر نگار لکھنؤ

بڑے دِن کا درخت اور ایک شادی

کل میں ایک شادی میں شریک ہوا..... مگر نہیں! پہلے میں بڑے دن کے ایک درخت کا قصہ سناؤں گا۔ شادی بہت عمدہ تھی اور مجھے پسند بھی بہت آئی مگر دوسرا واقعہ اُس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ معلوم نہیں شادی کے منظر نے مجھے بڑے دن کے درخت کی کیوں یاد دلادی، بہرحال وہ واقعہ اس طرح ہوا۔

ٹھیک پانچ برس ہوئے، سال نو کے موقع پر ایک صاحب نے جو تجارتی دنیا میں کافی شہرت رکھتے ہیں بڑی پہونچ کے آدمی ہیں، بڑے لوگوں سے تعلقات ہیں، ملاقاتیوں کا دائرہ بھی وسیع ہے اور ترکیبیں بھی خوب جانتے ہیں، مجھے بچوں کے ایک ناچ میں مدعو کیا معلوم ایسا ہوتا تھا کہ بچوں کا ناچ محض اس کا بہانہ ہے کہ والدین ایک جگہ جمع ہوں اور اپنی دلچسپی کی چیزوں کے متعلق گفتگو کریں۔

میں اس مجمع میں اجنبی شخص تھا اور چونکہ مجھے کسی معاملہ سے کوئی تعلق نہ تھا اس لئے میں نے دوسروں سے بے نیاز رہکر اپنی شام گزاری۔ میری طرح حاضرین میں ایک صاحب اور بھی تھے جو یونہیں اس موقع پر آگئے تھے۔ سب سے پہلے میری توجہ اُسی شخص کی طرف منتقل ہوئی۔ صورت سے وہ اعلیٰ خاندان کا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اُس کا قد لمبا اور چھریرا تھا، وہ خوش پوشاک تھا اور نہایت سنجیدہ معلوم ہوتا تھا۔ بظاہر اُسے اس تقریب سے کوئی دلچسپی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ جیسے ہی وہ ایک گوشہ میں گیا اُس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہوگئی اور اُس کی سیاہ گھنی بھوؤں پر بل آگئے۔ وہ اس مجمع میں بجز میزبان کے اور کسی کو نہیں جانتا تھا۔ اُس کے چہرے سے تکلیف کے آثار نمایاں تھے مگر بظاہر وہ بہت خوش نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ یہ شخص کسی صوبہ کا رہنے والا ہے اور یہاں پایۂ تخت میں، کسی اہم کام کے سلسلہ میں آیا ہوا ہے اور ہمارے میزبان کے پاس ایک تعارفی خط لایا ہے چنانچہ انھوں نے اخلاقاً اسے بھی ناچ میں مدعو کرلیا تھا۔

اور لوگ نہ اُس کے ساتھ تاش کھیلتے تھے نہ اُسے سگار پیش کرتے تھے۔ کوئی اُس سے گفتگو بھی نہیں کرتا تھا۔ غالباً انھوں نے چڑیا کو اُس کے پر ہی دیکھ کر دور سے پہچان لیا تھا۔ بہرحال جب اُس کو اپنے ہاتھ استعمال کرنے کا کسی اور کام میں موقع نہ ملا تو وہ بیچارہ اس تمام وقت اپنی مونچھوں ہی کو تاؤ دیتا رہا۔ اُسکی مونچھیں

بیشک اچھی تھیں مگر وہ انھیں ایسی توجہ سے اٹھتا تھا جس سے یہ معلوم ہوتا کہ شاید دنیا میں پہلے مونچھیں پیدا ہوئیں اور اس کے بعد آدمی تاکہ وہ انھیں مروڑتا ہی رہے۔

مہمانوں میں ایک اور شخص تھا جس سے مجھ کو دلچسپی پیدا ہو گئی۔ مگر وہ بالکل دوسرے رنگ کا تھا۔ وہ ایک معزز آدمی تھا اور لوگ اُسے کوچ کے نام سے پکارتے تھے، پہلی ہی نظر میں ہر شخص معلوم کر سکتا تھا کہ وہ بہت معزز شخص ہے اور اُس کے تعلقات میزبان سے اُسی طرح کے ہیں جس طرح میزبان کے تعلقات مونچھوں والے حضرت سے۔ میزبان اور اس کی بیوی دونوں اُس سے چکنی چپڑی باتیں کرتے رہتے، ہر وقت اُسی کی طرف متوجہ رہتے، اُس کو اپنی طرف مایل کرنے کی کوشش کرتے رہتے، اُس کے پاس دوسروں کو لا لا کر تعارف کراتے مگر خود اُس کو کسی کے پاس نہ لیجاتے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ جب کوچ نے یہ کہا کہ میں نے بہت کم ایسی خوشگوار شام گزاری ہے تو میزبان کی آنکھوں میں (خوشی کے مارے) آنسو جھلکنے لگے۔ لیکن کچھ دیر کے بعد نہ معلوم کیوں، مجھے اس معزز مہمان کے سامنے وحشت سی معلوم ہونے لگی۔ چنانچہ بچوں سے جی بہلانے کے بعد جن میں وہ تو خود میزبان کے تھے ہی ایک چھوٹی بیٹھک میں چلا گیا جہاں گملے رکھے تھے اور کوئی نہ تھا۔

بچے بڑے بھولے بھالے تھے اور باوجود اپنی والدہ اور انا کی کوششوں کے ان پر نہ پڑے تھے۔ انھوں نے کرسمس کے درخت کو ایک پل میں صاف کر دیا اور اپنے آدھے کھلونوں کا، پیشتر اس کے کہ انھیں اس کا علم ہو کہ کون کس کا ہے، وہ خاتمہ کر چکے تھے۔ ان تمام بچوں میں سے ایک بچہ خصوصاً نہایت خوبصورت تھا، اُس کی آنکھیں سیاہ تھیں اور بال گھونگھر والے، اور وہ اپنی لکڑی کی بندوق سے میری طرف برابر نشانہ لگایا کرتا۔ لیکن جس بچہ میں سب سے زیادہ دلکشی تھی وہ اُس کی ۱۱ سالہ بہن تھی جو کیوپڈ کی طرح پیاری تھی۔ وہ کسی بات پر بچوں سے بگڑ گئی اور اُسی کمرہ میں آئی جس میں میں تھا۔ وہاں وہ ایک کونے میں اپنی گڑیا لیکر بیٹھ گئی۔

"اس کا باپ نہایت ہی دولتمند تاجر ہے"۔ مہمان ایک دوسرے سے ایک حیرت کے لہجہ میں کہہ رہے تھے۔ "اُس نے اُس کے جہیز کے لئے ابھی سے ۳ لاکھ روبل نکال کر رکھ دئے ہیں"۔

جو لوگ یہ گفتگو کر رہے تھے ان کی طرف دیکھنے کو جونہی میں مڑا، میری نگاہیں کوچ سے چار ہو گئیں۔ وہ اس غیر دلچسپ گفتگو کو بہت توجہ سے اپنے ہاتھ پشت پر رکھے ہوئے اور سر کو ایک طرف جھکائے ہوئے سن رہا تھا۔

اِس تمام انتظار میں، میں اپنے میزبان کی تعریف کرتا رہا کہ اُس نے کس ہشیاری سے انعامات تقسیم کئے تھے لاکھوں روبل والے جہیز کی بچی کو سب سے قیمتی گڑیا ملی تھی اور بقیہ انعامات والدین کی حیثیت کے مطابق تھے۔

آخری بچے کو قدرت کی کہانیوں کی ایک چھوٹی سی کتاب ملی جس میں تصویریں تک نہ تھیں۔ یہ بچہ دس برس کا تھا۔ اس کا جسم لاغر اور بال سرخ تھے اور وہ انا کا بچہ تھا، یہ انا ایک غریب بیوہ تھی اور اُس کا چھوٹا لڑکا بہت معمولی سی جیکٹ پہنے ہوئے تھا اور بہت دبا دبا دکھائی پڑتا تھا۔ اُس نے کتاب اُٹھالی اور آہستہ آہستہ بچوں کے کھلونوں کی طرف گھومنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان بچوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے ہر قیمت پر طیار ہے مگر اُس کی ہمت نہ پڑتی تھی اور یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی حیثیت سمجھ رہا ہے۔

مجھے بچوں کو غور سے دیکھنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ یہ اپنا سکہ جمانے کی جو سعی کرتے ہیں اُسے دیکھنے میں بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ لال بالوں والا لڑکا دوسرے بچوں کی چیزیں کتنی للچائی ہوئی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ خاص کر کھلونوں کے تھیٹر میں حصہ لینے کو تو وہ بہت بیقرار تھا۔ چنانچہ وہ دوسرے لڑکوں کی چاپلوسی کرنے پر بھی تیار ہوگیا۔ وہ ایک دفعہ مسکرایا اور ان کے ساتھ کھیلنے لگا۔ اُس کے پاس ایک امرود تھا۔ اسے اُس نے ایک دوسرے بچہ کو دیدیا جس کی جیبیں مٹھائیوں سے بھری تھیں۔ ایک اور چھوٹے بچہ کو اُس نے اپنی پیٹھ پر بھی بٹھالیا ــــ اور یہ سب وہ محض اس وجہ سے کر رہا تھا کہ اُس کو تھیٹر کے ساتھ رہنے کی اجازت مل جائے ــ لیکن تھوڑی دیر میں ایک لڑکے نے اُس کے زور سے ایک گدّا رسید کیا مگر اُس بیچارے کو چیخنے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ اتنے میں انا آگئی اور اُس نے اس سے کہا کہ دوسرے لڑکوں کے کھیل میں حصہ نہ لے چنانچہ وہ بیچارہ بھی اُسی کمرہ میں آگیا جہاں میں اور وہ لڑکی بیٹھی تھی ــ لڑکی نے اُسے اپنے پاس بٹھالیا اور دونوں اُس قیمتی گڑیا کو کپڑے پہنانے لگے۔

اس حالت میں تقریباً نصف گھنٹہ گزر گیا۔ میں اُسی کمرہ میں بیٹھا تقریباً اونگھ رہا تھا اور اُس دولتمند کمسن بچہ اور لال بالوں والے لڑکے کی باتیں بھی کان میں پڑجاتی تھیں کہ یکایک کوچ کمرہ میں داخل ہوا جسوقت بچے کسی بات پر شور مچا رہے تھے وہ ڈرائنگ روم سے اس کمرہ میں چلا آیا تھا۔ میں نے اپنے اس گوشہ سے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ کچھ دیر پہلے وہ اس لڑکی کے باپ سے بہت سرگرمی سے گفتگو کر رہا تھا جس سے اُس کا تعارف اُسی وقت کرایا گیا تھا۔

پہلے وہ کچھ دیر کھڑا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی اُنگلیوں پر کچھ آپ ہی آپ شمار کر رہا ہے ــــ "تین سو ــــ تین سو ــــ گیارہ ــــ بارہ ــــ تیرہ ــــ سولہ ــــ پانچ برس میں! اچھا ہم فیصدی رکھ لیجئے ــــ بارہ پنجے ــــ ساٹھ ــــ اور اس ساٹھ پر ــــ فرض کیجئے کہ ۵ برس میں اس کی تعداد ــــ سمجھ لیجئے ــــ چار سو ہوجائے گی ــــ ہوں ــــ ہوں! ــــ مگر وہ بڈھا خرانٹ ۴ فیصدی پر نہیں راضی ہونے والا ہے۔ شاید اُس کو آٹھ یا دس کے حساب سے ملتا ہے۔ فرض کر لیجئے پانچ سو یا پانچ ہزار ــــ یہ تو کم از کم یقینی ہے

اس کے علاوہ جیب خرچ — ہوں!—"

وہ کمرہ سے پلٹنے ہی والا تھا کہ اُس کی نظر لڑکی پر پڑ گئی اور وہ وہیں خاموش کھڑا ہو گیا۔ اتفاق سے میں چونکہ گملوں کے پیچھے تھا اس لئے وہ مجھے نہ دیکھ سکا مگر مجھے ایسا نظر آ رہا تھا کہ گویا وہ کانپ رہا ہے۔ شاید وہ اپنے اعداد و شمار کی وجہ سے گھبرا سا گیا ہو۔ بہرحال وہ اپنے ہاتھ ملکر ایک کونے سے دوسرے کونے تک ٹہلنے لگا اور اُس کا جوش بڑھتا ہی گیا۔ آخر کار اس نے اپنے جذبات پر قابو حاصل کیا اور خاموش کھڑا ہو گیا۔ ایک مرتبہ اُسنے اپنی ہونے والی بیوی کی طرف غور سے دیکھا اور اُس کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا مگر پھر چاروں طرف گھوم کر دیکھا اور اس کے بعد گویا ایک گناہگار ضمیر لئے ہوئے وہ بچہ کی طرف بڑھا، اور جھک کر اس کی پیشانی پر ایک بوسہ لیا۔

اُس کا اس طرح آنا اس قدر خلاف توقع تھا کہ لڑکی زور سے چیخ اُٹھی۔

"پیاری بچی۔ یہاں کیا کر رہی ہو" اُس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے اور اُس کے گال دباتے ہوئے کہا۔

بچی نے جواب دیا۔ "ہم لوگ کھیل رہے ہیں"۔

"آئیں! اس کے ساتھ؟" کوچ نے اتنا کے لڑکے کی طرف ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"لڑکے۔ تم ڈرائنگ روم جاؤ" کوچ نے لڑکے سے کہا۔

لڑکا خاموش بیٹھا رہا اور اس اجنبی کو آنکھ پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ کوچ نے ایک مرتبہ پھر ہوشیاری سے چاروں طرف دیکھا اور لڑکی کی طرف جھک کر کہا:۔

"مائی ڈیر — تم کیا چیز لئے ہوئے ہو، گڑیا!!

"ہاں جناب" لڑکی یہ کہکر جھجک گئی اور اس کی ابروؤں پر بل آ گئے۔

"اچھا گڑیا ہے؟ اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ گڑیا کیسے بنائی جاتی ہے؟"

"نہیں جناب" اُس نے کمزور آواز میں کہا اور اپنا سر جھکا لیا۔

"چیتھڑوں سے، مائی ڈیر" "اے لڑکے۔ تم یا تو ڈرائنگ روم چلے جاؤ یا لڑکوں کے پاس"۔ کوچ نے لڑکے کی طرف دیکھ کر کہا۔

مگر یہ بات دونوں بچوں کو بُری معلوم ہوئی اور دونوں نے ایک دوسرے کو پکڑ لیا — وہ جدا ہونے کیلئے تیار نہیں تھے۔

"اچھا۔ تم یہ جانتی ہو کہ تمھیں یہ گڑیا کیوں دی گئی؟" کوچ نے اپنی آواز کو اور آہستہ بناتے ہوئے کہا

"نہیں"

"کیونکہ تم اس پورے ہفتہ بہت اچھی لڑکی رہیں"۔

یہ کہتے ہی کودچ کے چہرہ کا رنگ بدلا۔ اُس نے چاروں طرف گھوم کر دیکھا اور اس قدر آہستگی سے جو سنائی بھی نہ دے کہا:-

"اگر میں تمہارے ابا۔ اماں کے پاس ملنے آؤں تو تم کو اچھا معلوم ہوگا؟"

اُس نے اُس چھوٹی خوبصورت ہستی کو بوسہ دینا چاہا مگر لال بالوں والے لڑکے نے دیکھا کہ وہ رونا چاہتی ہے۔ یہ دیکھتے ہی اُس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُس کی ہمدردی میں زور سے رونے لگا۔ اس پر وہ غصہ ہو گئی۔

"چلے جاؤ یہاں سے چلے جاؤ۔ اپنے ساتھیوں کے پاس دوسرے کمرہ میں جاؤ!"

"نہیں - میں نہیں چاہتی کہ وہ جائے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ یہاں سے جائے۔ تم چلے جاؤ"

لڑکی چلا کر بولی - "اُسے رہنے دو - اُسے رہنے دو" اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے - دروازہ پر پاؤں کی چاپ معلوم ہوئی - کودچ اچھل پڑا اور لال بالوں والا لڑکا اور بھی گھبرا گیا - اُس نے لڑکی کا ہاتھ چھوڑ دیا دیوار کی طرف بڑھا اور ڈرائنگ روم سے ہوتا ہوا کھانے کے کمرہ میں چلا گیا۔

اس خیال سے کہ کوئی دیکھنے نہ پائے کودچ بھی ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ اس کا چہرہ اسوقت سرخ ہو رہا تھا اور آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ کر خود اُس کی پریشانی کے آثار نظر آرہے تھے۔ غالباً وہ اپنی بیصبری پر خود ہی ناراض تھا۔ اپنی پوزیشن اور اپنے رتبہ کا خیال کئے بغیر وہ ایک بچہ کی طرح اپنے مقصود کی طرف جھپٹا پڑا تھا میں ان حضرت کے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم میں چلا گیا اور وہاں عجیب تماشہ دیکھنے میں آیا۔

کودچ جس کی نگاہوں سے قہر ٹپک رہا تھا لڑکے کو ڈانٹنے لگا۔ لال بالوں والا لڑکا پیچھے ہٹتا چلا گیا یہاں تک کہ بیچارے کے لئے اور زیادہ ہٹنے کی جگہ ہی نہ رہ گئی :-

"نکل جا یہاں سے - یہاں کیا کر رہا ہے نکل، بدمعاش کہیں کا - چل چلا رہا ہے۔ ایں ہاں بول چل چرا رہا ہے - نکل خبیث اور جا اپنے دوستوں کے پاس -

بیچارہ خوفزدہ لڑکا ڈر کے مارے اُس سے بچنے کے لئے میز کے نیچے گھس گیا مگر کودچ کو یہ خیال آگیا تھا اور اُس نے اپنے بڑے رومال کو کوڑے کی طرح اُس پر استعمال کر کر کے اُسے باہر نکلنے پر آخر مجبور ہی کر دیا۔

یہاں میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ کودچ کس قدر رحیم کریم آدمی تھا۔ اُس کے گال پھولے ہوئے تھے اور گھٹنے وغیرہ گول تھے۔ اسوقت اُس کے پسینہ نکل رہا تھا اور وہ سانس بڑی زور زور سے لے رہا تھا۔ اس لڑکے سے اُس کو اتنی نفرت (یا رقابت؟) تھی کہ وہ بالکل پاگل کی طرح کام کرنے لگا۔

میں یہ دیکھ کر زور سے ہنسنے لگا۔ کودچ نے پلٹ کر دیکھا اور مجھے دیکھتے ہی گھبرا گیا بلکہ تھوڑی دیر کے لئے شاید وہ اپنی عظیم الشان ہستی کو بھی بھول گیا تھا۔ ٹھیک اُسی وقت میزبان صاحب سامنے کے دروازہ سے نکلے

لڑکا میز کے نیچے سے نکلا اور اپنی کہنیاں اور گھٹنے صاف کئے - کووچ نے جلدی سے اپنا رومال اُٹھایا جس سے وہ بچہ کو مار رہا تھا - ہمارے میزبان نے ہم تینوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا - مگر ایک زمانہ ساز آدمی کی طرح اُس نے اس موقع سے یہ فایدہ اُٹھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنے معزز مہمان پر اپنا قابو جمائے اور اُس سے اپنا کام نکال لے -

"یہ دیکھئے - یہ وہی لڑکا ہے جس کی بابت میں آپ سے عرض کر رہا تھا" اُس نے لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا :-

"ہوں" کووچ نے جواب دیا - ابھی تک اس کی سانس ٹھیک نہیں ہوئی تھی -

"یہ میری آقا کا لڑکا ہے" میزبان نے بہت عاجزی کے لہجہ میں کہنا شروع کیا - "وہ بیچاری بہت غریب ہے، ایک ایماندار افسر کی بیوہ - اسی وجہ سے اگر آپ کے لئے ممکن ہو تو ——"

بالکل ناممکن! — بالکل ناممکن! فلپ الیکسیوچ! معاف کرنا - میں یہ نہیں کر سکتا - میں نے دریافت کیا تھا - کوئی جگہ خالی نہیں ہے اور دس آدمیوں کا نام امیدواروں کی فہرست میں پہلے ہی سے موجود ہے جو زیادہ مستحق ہیں - مجھے بہت افسوس ہے - کیا بتاؤں!

"یہ تو بہت بُرا ہوا" - ہمارے میزبان نے کہا "یہ بیچارہ بڑا سیدھا لڑکا ہے"

مگر میرے خیال میں تو بڑا پاجی ہے" - کووچ نے کہا - "جا یہاں سے لڑکے - ابھی تک یہاں کیوں موجود ہے؟ جا دوسرے لونڈوں کے پاس -

اس کے بعد وہ ضبط نہ کر سکا اور میری طرف کنکھیوں سے دیکھا - میں بھی اپنے اوپر قابو نہ حاصل کر سکا اور ہنسنے لگا - اُس نے پلٹ کر میزبان سے دریافت کیا کہ یہ نوجوان آدمی کون ہے - دونوں نے پھر آہستہ سے کچھ باتیں کیں اور میری پرواہ کئے بغیر کمرہ چھوڑ دیا -

میں ہنسی کے مارے بیتاب ہو گیا اور پھر ڈرائنگ روم میں چلا گیا - یہاں یہ بزرگوار، ایک خاتون سے جن سے ان کا اُسی وقت تعارف کرایا گیا تھا گھل مل کر باتیں کر رہے تھے - یہ خاتون اُس دولتمند چھوٹی بچی کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی - کووچ بچی کی خوبصورتی، اُس کی عقل، اُس کی تہذیب اُسکی تمیز کی تعریف کر رہے تھے - جس سے مقصد یہ معلوم ہوتا تھا کہ ماں پگھل جائے - چنانچہ وہ اپنی چھوٹی لڑکی کی تعریفیں سن سن کر خوشی کے مارے پھولے نہ سماتی تھی اور اُس کی آنکھ سے خوشی کے آنسو نکلے پڑتے تھے - بچی کا باپ بھی اپنے تبسم سے اپنی مسرت کا اظہار کر رہا تھا - اس کے بعد میں نے سنا کہ بچی کی ماں نے جس پر خاص اثر ہوا تھا نہایت شستہ الفاظ میں اور بہت اخلاق کے ساتھ کووچ سے درخواست کی کہ وہ ان کے یہاں آکر ان کی عزت افزائی کا موقع دے - کووچ نے نہایت

گرمجوشی سے اس دعوت کو منظور کرلیا۔ اتنے میں مہمان اُس جگہ سے منتشر ہوگئے پھر میں یہ سنتا رہا کہ سب کے سب اُس تاجر، اُس کی بیوی، اُس کی لڑکی اور خاصکر مسٹر کوویچ کی بہت ادب سے اور بہت پرزور الفاظ میں تعریفیں کر رہے ہیں:-

"کیا اُس کی شادی ہوچکی ہے؟" میں نے اپنے ایک ملاقاتی سے جو کوویچ کے پاس کھڑا تھا زور سے دریافت کیا۔ کوویچ نے میری طرف زہر آلود نگاہوں سے دیکھا۔

"نہیں" میرے دوست نے جواب دیا۔ میری اس ارادی بے عنوانی پر اُسے سخت حیرت ہوئی تھی!.....

کچھ عرصہ کے بعد میں ـــــ کے گرجے کی طرف گزرا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ایک شادی کو دیکھنے کے لئے صدہا آدمیوں کا اجتماع ہے اُس روز موسم ناخوشگوار تھا۔ پانی برسنا شروع ہوگیا تھا۔ میں مجمع سے ہوتا ہوا گرجے کے اندر داخل ہوگیا۔ دولھا ایک گول بدن کا، موٹا سا، پستہ قد آدمی تھا۔ وہ اِدھر اُدھر دوڑتا پھرتا اور احکامات دیتا پھرتا۔ آخرکار یہ اطلاع ملی کہ دولہن آرہی ہے۔ میں مجمع کو دھکا دیتا ہوا سامنے آگیا اور دیکھا کہ میری نظروں کے سامنے ایک مجسمہ حسن و جمال چلا آرہا ہے جس کے حسن کی پہلی بہار ابھی ابھی مشکل سے شروع ہوئی ہوگی۔ مگر یہ پیکر حسن رنجیدہ معلوم ہو رہا تھا اور اُس کے چہرہ پر زردی تھی۔ اور مجھے تو ایسا نظر آرہا تھا کہ اُس کی آنکھیں ابھی ابھی رونے کی وجہ سے سُرخ ہو رہی تھیں۔ اُس کے چہرہ کا ہر خط اُس کے حسن کی سنجیدگی میں اضافہ کر رہا تھا مگر اس سنجیدگی اور اس رنج میں بچپن کی معصومیت ہویدا تھی اُس کے خط و خال میں کچھ ناقابل بیان سادگی پائی جاتی تھی جو اپنی خاموش زبان میں دو سروں سے رحم کی التجا کر رہی تھی۔

لوگ کہہ رہے تھے کہ دولھن صرف ۱۶ برس کی ہے۔ میں نے دولہا کی طرف غور سے دیکھا۔ یکایک میں نے جولین مسٹاکوویچ کو پہچان لیا جس کو میں نے ان پانچ سال کے درمیان میں ایک دفعہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ اسکے بعد میں نے دولھن کی طرف پھر غور کرکے دیکھا ـــ اللہ کی پناہ! میں جتنی جلد مجمع سے ہوتا ہوا گرجے سے باہر مجمع میں لوگ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ دولہن بہت مالدار ہے ـــ دو لاکھ روبل جہیز میں ملا ہے۔ اتنا اتنا جیب خرچ کے لئے ہے ـــ"

"تو اس کا اندازہ ٹھیک تھا" ـــ جب میں سڑک پر آگیا تو میں نے خیال کیا۔

(ایم - ڈوسٹوویسکی)

نگار جنوری ۳۵ء کی بہت کم جلدیں رہ گئی ہیں اس کا مطالعہ کرنا گویا شعرا کے تمام تذکروں اور تاریخ اُردو کا مطالعہ کرنا ہے اس کی ضخامت ۲۰۶ صفحات قیمت عہ علاوہ محصول - منیجر نگار لکھنؤ

جاپان اور تحریکِ حزب العمال

جب سے دُنیا میں فیکٹری سسٹم یعنی مشینوں کا آغاز ہوا ہے مزدوروں کو بوجہ ایک جگہ کام کرنے کے اکٹھا ہونے کا موقع ملا۔ اور اُنھوں نے اپنی بھلائی اور حقوق کے لئے جد و جہد شروع کر دی۔ اس تحریک کو "تحریکِ حزب العمال" کہتے ہیں۔ اور یہ اب تمام صنعتی ممالک میں پھیل چکی ہے۔

جاپان میں چونکہ ۱۸۶۸ء سے قبل لوگ زیادہ تر زراعت پیشہ تھے اس لئے کسی حزب العمال یا ٹریڈ یونین وغیرہ کے بنانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ تاہم جب صنعتی و تجارتی انقلاب شروع ہوا تو کارخانوں کیلئے کاریگروں کی ضرورت ہوئی لیکن چونکہ لوگ فیکٹریوں میں کام کرنا بُرا سمجھتے تھے اس لئے ماہرین اس کام کے لئے میسر نہ آئے بدیں وجہ مالکوں نے اردگرد کے مواضعات سے مچھیروں کی لڑکیاں بھرتی کرنا شروع کر دیں اور اُن کو ایک بورڈنگ ہاؤس میں رکھا گیا۔ جہاں اُن پر نارواسختی برتی جاتی تھی، اُن کی جائز آزادی میں خلل ڈالا جاتا تھا خوراک بھی اچھی نہیں دیجاتی تھی اور کام زیادہ لیا جاتا تھا۔ چونکہ جاپانی اپنے فلسفہ اور مذہب کی بنا پر پبلک پروٹسٹ یا احتجاج عامہ کو بُرا خیال کرتے تھے اس لئے کسی کو جماعتِ عاملہ کے حالات سے دلچسپی پیدا نہ ہوئی اور نہ لڑکیوں کو اُن کے حقوق دئے گئے۔

اُنیسویں صدی کے اخیر میں جاپانیوں کا معیارِ زندگی بڑھ گیا اور مزدوروں کو احساس ہوا کہ اُن کو اپنی ضروریات کے لئے زیادہ روپیہ کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مغرب میں تحریکِ حزب العمال کی داغ بیل ڈالی گئی اور وہاں سے "وقارِ مزدوری" (Dignity of Labour) کے خیالات جاپان میں آنے شروع ہوئے۔ ان سب باتوں کے اجتماع نے جاپان کے مزدوروں کو اتحاد پر مجبور کیا اور وہ ٹریڈ یونین بنانے لگے۔

شروع شروع میں حکومت کی طرف سے مخالفت ہوئی کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ لوگ پبلک پروٹسٹ کا حربہ استعمال کریں۔ اس لئے حزب العمال کا بنانا قانوناً منع قرار دیا گیا۔ چنانچہ عرصۂ دراز تک یہ تحریک دبی رہی۔ جنگ کے بعد چونکہ جماعتِ عاملہ کی بہبودی کے متعلق مغربی خیالات کثرت سے جاپان میں آنے لگے

اور کچھ صنعت و تجارت نے بھی فروغ پایا اس لئے لوگوں نے پروٹسٹ شروع کر دیا اور گورنمنٹ بھی کچھ نہ کر سکی اور سرکاری طور پر اس حق کو تسلیم کر لیا گیا۔ اور مقاطعے اب ناجائز نہ رہے۔ چنانچہ جنگ کے بعد بہت سی ہڑتالیں ہوئیں جن میں عاملین جہاز اور چاول والوں کی شورش بہت مشہور رہی۔

سنہ ۱۹۱۴ء اور سنہ ۱۹۲۰ء کے درمیان چونکہ مصارفِ حیات زیادہ ہو گئے اور انقلاب روس نے جاپان کی جمعیتہ عاملہ کے خیالات کو زیادہ وسیع کر دیا اس لئے مزدوروں نے معاوضہ کی زیادتی کے لئے درخواستیں دیں اور احتجاج عامہ کیا۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں ایک جمعیتہ عاملہ General Federation بنی جو ایک طرح سے مطالباتِ جماعتِ عاملہ کے لئے ایک مرکزی کمیٹی تھی اور سنہ ۱۹۲۶ء سے ٹریڈ یونین رجسٹرڈ ہونی شروع ہو گئی ہیں۔ اس طرح سے گویا جاپان کی تحریک حزب العمال کے فروغ پانے کے پانچ اسباب ہیں۔

۱۔ فیکٹری سسٹم کا آغاز جس سے اجتماع میں آسانی ہوئی۔

۲۔ معیارِ زندگی کا بڑھنا۔

۳۔ جماعتِ عاملہ کے متعلق مغربی اور روسی خیالات سے متاثر ہونا

۴۔ جاپان میں مابعد جنگ عاملین کی تعداد میں اضافہ

۵۔ نیم سرکاری طور پر حزب العمال کا منظور ہونا

حزب العمال کے فروغ میں ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ اس کام کے لئے روپیہ میسر نہ ہوتا تھا صرف جہاز رانی کی صنعت والوں کے پاس کچھ روپیہ تھا۔ لیکن وہ بھی کیونکر ہو کر اپنے حقوق کی حفاظت نہیں کرتے تھے علاوہ اس کے سب سے بڑا مانع ایک یہ تھا کہ سرکاری طور پر اس تحریک کی مخالفت کی جاتی تھی اور دوسرے یہ کہ اپنے روایات مذہبی کی بنا پر وہ احتجاج عام کو پسند بھی نہ کرتے تھے۔ ہر چند حکومت نے بعد کو ہڑتالیوں کو اجازت دیدی تھی لیکن پرزور مطالبہ یا شورش کی اب بھی اجازت نہیں تھی۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ حزب العمال وہاں کیا کرتی ہے اور یہ تحریک کس حد تک اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئی ہے۔ یہ انجمنیں وہاں بالعموم مندرجۂ ذیل مقاصد کو لیکر معرضِ ترتیب میں آتی ہیں۔

۱۔ اوقاتِ کار کی کمی۔ سرمایہ دار چاہتا ہے کہ وہ مزدوروں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے تاکہ پیداوار (Production) دولت زیادہ سے زیادہ ہو اور مصارف کم سے کم ہوں۔ لیکن مزدور اپنا سارا وقت فیکٹری کے لئے صرف کرنے کے لئے طیار نہیں ہیں کیونکہ ان کو اپنی زندگی کے لئے اور کام بھی کرنا ہوتے ہیں اس لئے ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کم سے کم محنت کریں جس کا ان کو زیادہ سے زیادہ معاوضہ ملے۔

۲۔ معاوضہ۔ مزدور کو ہمیشہ یہ خیال رہتا ہے کہ شاید سرمایہ دار اس کو لوٹ رہا ہے اور سب نفع خود کھا جاتا ہے

اس لئے وہ احتجاج کرتا ہے کہ اُس کی تنخواہ اور مزدوری بڑھائی جائے

۳- اگر کارگاہ (Working Place) کی حالت خراب ہو تو ظاہر ہے کہ مزدور وہاں کام کرنا نہیں چاہے گا مثلاً چھت ٹپکتی رہتی ہو۔ آگ یا دیگر حوادث سے حفاظت کا کوئی سامان نہ ہو۔ منھ دھونے، کپڑے ٹانگنے کے لئے کوئی جگہ نہ بنائی جائے وغیرہ۔ اس لئے مزدوروں کا ایک مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ کارگاہ کی حالت بہتر سے بہتر بنائی جائے۔

۴- اس کے علاوہ مزدور چاہتے ہیں کہ ان کی پوزیشن بلند ہو۔ وہ ماتحت۔ غلام اور ملازم نہ کہلائیں۔ اس جذبہ کو (Dignity of Labour) یا وقارِ مزدوری کہتے ہیں۔

۵- اُن کی یہ بھی مرضی ہے کہ سرمایہ دار اُن کی تعلیم، تفریح اور ورزش وغیرہ کا انتظام کریں اسکو ہم فلاحی کام Welfare work یا بہتری و بہبودی کا کام کہہ سکتے ہیں۔

جہاں تک مزدوری یا اُجرت کا تعلق ہے ہم اسے کافی تسلی بخش کہہ سکتے ہیں۔ ہاں فیکٹری میں کام کرنے والے مزدور کو کم از کم ایک ین پچاس سینٹ اور زیادہ سے زیادہ دو ین تیس سینٹ روزانہ ملتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اُن کی آمدنی سوا روپیہ اور دو روپئے کے درمیان ہے۔ ہر چند یہ آمدنی ہندوستان کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اور مغربی ممالک کے مقابلہ میں بہت کم ہے، لیکن جب ہم جاپانیوں کے معیارِ زندگی اور کنبہ پروری کے نظام کی طرف خیال کرتے ہیں تو ہمیں یہ اُجرت کم معلوم نہیں ہوتی۔ عورتیں مردوں سے کم کماتی ہیں۔ انکی آمدنی ۵۰ سینٹ روزانہ ہے۔ یعنی ۱۰ر کے قریب۔ یہ تو کارخانوں کے مزدوروں کا حال تھا زرعی مزدوروں کی حالت تسلی بخش نہیں مثلاً یہاں مردوں کی روزانہ اُجرت ۵۰ سینٹ (۱/۲ ۲ آنے) ہے عورتوں کی ۳۰ سینٹ (۱/۴) اور بچوں کی صرف ۱۵ سینٹ۔ (۲/۱) یہ اُجرت مستقل کام کرنے کی ہے جن مزدوروں کو صرف ایک موسم کے لئے رکھا جاتا ہے اُن کو ڈیوڑھی اُجرت یا اس سے بھی زیادہ دیجاتی ہے ہر کاشتکار خاندان کی جس میں پانچ چھ افراد شامل ہوتے ہیں اوسط آمدنی ۱۲۰۰ این سالانہ ہوتی ہے یعنی قریباً ۸۱۲ روپئے سالانہ اور ۶۸ روپئے ماہوار ظاہر ہے کہ ایک زمیندار خاندان کے لئے یہ آمدنی کافی ہے کیونکہ خورد و نوش کی چیزیں وہ مفت مہیا کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ گوشت بالکل نہیں کھاتے مچھلی استعمال کرتے ہیں لیکن اُسے وہ گوشت نہیں سمجھتے زیادہ تر جاپانیوں پر گزرا ہے اور بہترین چاول ایک ین کے یعنی ۱۳ر کے پانچ سیر آجاتے ہیں۔ مچھلی سستی ہے اور سمندر قریب ہونے کی وجہ سے بافراط ہوتی ہے۔ یہ لوگ سیپی کا شوربہ بھی بڑے مزے سے پکا کر کھاتے ہیں۔ اور سیپی سمندر سے مفت مل سکتی ہے۔ اس لئے جاپانیوں کی معیارِ زندگی کے لحاظ سے مزدوروں کی اُجرت کم نہیں ہے لیکن چونکہ اب ضروریات بڑھ رہی ہیں اور چاول کی قیمت بھی چڑھ رہی ہے اس لئے حزب العمال والے چاہتے ہیں کہ مزدوری بڑھائی جائے

جاپان کے اوقاتِ کار مغربی ممالک کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں۔ بعض فیکٹریوں میں تیرہ تیرہ چودہ چودہ گھنٹے مسلسل کام کرنا ہوتا ہے درمیان میں ناشتہ کرنے کے لئے صرف آدھ گھنٹہ کا وقفہ ہوتا ہے۔ یہ اوقات بہت زیادہ ہیں خصوصاً اس حالت میں کہ مزدوروں میں زیادہ تعداد عورتوں اور بچوں کی ہوتی ہے۔ وہاں فیکٹریوں میں اگر ۴۹ مرد کام کرتے ہیں تو ۵۱ فیصدی عورتیں ہوتی ہیں۔ ان عورتوں میں کم عمر بچے بھی شامل ہیں بچوں کی تعداد کل صنعتی آبادی کی ۱۰ فیصدی ہے۔ عورتوں کی تعداد صرف پارچہ بافی کی صنعت میں سوا لاکھ ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر عورتوں اور بچوں سے ۱۰ - ۱۲ گھنٹے روزانہ مسلسل کام لیا جائے تو یقیناً اس کو ظلم کہا جائیگا کیونکہ اس حالت میں نہ تو عورتیں خانگی اُمور کی طرف توجہ کر سکتی ہیں اور نہ بچے تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ جب لڑکی ۲۴ - ۲۵ سال کی ہو جاتی ہے تو وہ فیکٹری چھوڑ دیتی ہے۔ لیکن اس عرصہ میں اُس کی صحت پر نہایت ناگوار اثر پڑتا ہے اور وہ شادی کا بار سنبھالنے کی اہل نہیں رہتی۔

پس جاپان کی جماعت عاملہ کا سب سے بڑا مسئلہ عورتوں اور بچوں کی ملازمت ہے جس کے خلاف تحریکِ حزب العمال موثر اقدام تو نہیں لے رہی لیکن بہرحال اُن کی حالت بہتر بنانے کے لئے حکومت پر زور دیتی رہتی ہے۔ ابھی میں نے بتایا ہے کہ حزب العمال کا یہ کام بھی ہوتا ہے کہ کارگاہ کی حالت بہتر بنانے کی طرف سرمایہ داروں کو متوجہ کرے۔ لیکن جاپان میں اس طرف سے بھی غفلت برتی گئی ہے۔ اکثر فیکٹریوں کی چھتیں اور فرش کچے ہیں اور وہاں حادثہ کا ہر وقت خطرہ ہے۔ الغرض کارخانوں کے ضوابط تاحال جاپان میں زیادہ سختی کے ساتھ مروج نہیں ہیں۔

مزدوروں کی صحت کی طرف بھی کوئی توجہ ابتک نہیں کی گئی۔ لڑکیوں کے لئے شہروں میں بورڈنگ ہاؤس بنے ہوئے ہیں جہاں اُن پر ناجائز سختی برتی جاتی ہے اور کھانے پینے کے لئے اچھی غذا نہیں دی جاتی۔ اسی کے ساتھ حفظانِ صحت اور طبی ضروریات کا بھی خاطر خواہ انتظام نہیں ہے۔

تاہم جماعتِ عاملہ کا وقار قائم کرنے کے لئے لوگوں میں جذبہ پیدا ہو رہا ہے اور وہ اپنے مزعومات و معتقدات کے علی الرغم غلامی اور ناانصافی کے خیالات کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔ اس لئے جاپان کی جماعت عاملہ کا مستقبل نہایت درخشاں ہے۔

عبدالرحیم شبلی

ضرورت ہے

نگار جنوری تا جون و اگست ۲۵ء۔ اپریل ۳۱ء۔ اپریل ۳۲ء۔ جنوری تا اپریل جون و ستمبر ۳۳ء جنوری فروری جولائی و اگست ۳۴ء اور مارچ جولائی اکتوبر ۳۵ء کی جو صاحب علیحدہ کرنا چاہیں اطلاع دیں۔
منیجر نگار

حروب صلیبیہ کی تاریخ کا ایک گمشدہ ورق

(مسلمانوں کے عسکری اخلاق کی ایک حیرتناک مثال)

اے سرزمین فلسطین کے مسافر اگر فرصت ہو تو تھوڑی دیر کے لئے حطین کے پہاڑ اور اس کی مختصر آبادی (طبریہ) پر بھی ایک نگاہ ڈال لے جو اسوقت خواہ کتنی ہی گمنام ہو لیکن زمانۂ ماضی میں غیر معمولی شہرت کی مالک تھی

طبریہ کی شہر پناہ جو کوہ آتش فشاں کے سیاہ پتھروں سے طیار کی گئی تھی ہر چند ۱۸۳۷ء کے زلزلہ میں تباہ ہو چکی ہے لیکن اس کی مسماریوں اور بربادیوں میں ہنوز اسکی زبردست قوت حرب و دفاع کی داستانیں پوشیدہ ہیں۔

سولہ سال قبل ولادت مسیح ہیرودس نے اس قریہ کی بنیاد ڈالی اور اس کے بعد اور قسطنطین کے تباہ ہونے پر اسرائیلیوں نے اس کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ ۶۳۷ء میں حضرت عمر نے اس کو حکومت اسلام میں شامل کیا لیکن عروب صلیبی کے دوران میں پھر مسیحی پادریوں کا دینی مرکز قرار پایا۔ ۱۱۸۷ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے اسپر قبضہ کیا اور تقریباً ایک صدی بعد ۱۲۴۷ء سے ۱۲۶۷ء تک پھر صلیبیوں کے پاس رہا۔ اس کے بعد وہ تیسری بار پھر عربوں کے تصرف میں آگیا اور ان سے ترکوں نے لے لیا یہاں تک کہ "شیخ ظاہر" نے باب عالی کے خلاف بغاوت کی اور اس مقام کو اپنا مرکز قرار دیا۔

۵۸۲ھ ہے اور ربیع الثانی کی دسویں تاریخ اس ناہموار سڑک پر جو شہر صفوریہ سے قلعۂ عکار کو جاتی ہے دو سوار جو عربی گھوڑوں پر سوار ہیں مختلف سمتوں سے آتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور بیک وقت دونوں کی زبان سے حیرت و مسرت کے الفاظ نکلتے ہیں۔

ایک — "اے عامر میں تو تمہارے ہی پاس جا رہا تھا۔ میرا سردار کونٹ روڈ میر حملہ کی طیاریاں کر رہا ہے۔

اور مجھے بھی اس کے ساتھ جانا ہے اس لئے میں نے سوچا کہ تم سے آخری بار چلکر مل لوں، کس کو خبر ہے کہ زندہ واپس آؤں یا نہیں۔

دوسرا ۔۔۔ "اے فلپ میں بھی تم سے رخصت ہونے آرہا تھا کیونکہ سلطان صلاح الدین لشکر کشی کا حکم دیچکا ہے اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہو۔

اس گفتگو کے بعد دونوں سوار اپنے اپنے گھوڑوں سے اُتر پڑے اور ایک دوسرے سے بغلگیر ہوکر وہیں ایک چٹان پر بیٹھکر باتوں میں مصروف ہوگئے۔

فلپ، فرانسیسی نوجوان تھا اور کونٹ روڈ کی فوج سے تعلق تھا۔ یہ کونٹ، صرف حروب صلیبی میں حصہ لینے کے لئے فرانس سے آیا تھا اور مختلف جنگوں میں اپنی جرأت کا ثبوت دے چکا تھا۔

ایک دن کوہستان ناپلس میں جنگ جاری تھی کہ میدان حرب کے کسی گوشہ میں فلپ کو ایک مجروح شخص نظر آیا جو زخموں سے چور چور تھا اور پیاس سے تڑپ رہا تھا۔ فلپ نے قریب جاکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ تو ایک مشہور عربی سردار ہے جس کو فلپ بارہا دیکھ چکا تھا اور جس کی شجاعت کا لوہا فرانسیسی مانے ہوئے تھے۔

فلپ نے فوراً اس کو پانی پلایا اور اس کا سر اپنی ران پر رکھکر زخموں کو دھونے لگا۔ جب عربی سردار کو کچھ سکون ہوا تو اس نے آنکھیں کھولدیں اور صلیبی سپاہی کو اپنے سرہانے دیکھ کر بولا کہ "اے نوجوان مجھے جلدی ہلاک کرڈال کیونکہ میرا جو فرض تھا وہ ادا کرچکا ہوں اور مجھے اب زندگی میں کوئی تمنا باقی نہیں۔

فلپ نے جواب دیا کہ "اے معزز سردار، کیا تم نے کبھی نہ سنا ہے کہ روڈلمبرگ کے کسی سپاہی نے مجروح و بدست و پا دشمن پر حملہ کیا ہو۔ اے عامر، اے تہامہ کے سردار میں میدان جنگ میں تم کو اور تمھاری شجاعت کو بارہا دیکھ چکا ہوں اور اس لئے مجھ سے زیادہ بزدل کون ہے اگر میں تم پر ہاتھ اٹھاؤں"۔

یہ جنگ ختم ہوگئی اور نتیجہ مسلمانوں کے خلاف نکلا لیکن فلپ پھر واپس نہیں گیا اور عامر کو اپنے ساتھ لیجاکر اس کے علاج میں مصروف ہوگیا یہاں تک کہ وہ صحتیاب ہوگیا اس کے بعد وہ دونوں جبل لبنان کی طرف چلے گئے اور عرصہ تک خاموش زندگی بسر کرتے رہے۔ درانحالیکہ صلیبی جنگیں برابر جاری تھیں اور عیسائیوں اور مسلمانوں میں ہنگامہ حرب وقتال بدستور قائم رہا۔

ایک دن عامر نے اپنے دوست فلپ سے کہا کہ "اگر تمھاری رائے ہو تو میں وادی تیم جاکر اپنے اعزہ و اقربا کو دیکھ آؤں"۔

فلپ نے جواب دیا کہ "میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ عکا جاکر اپنے عزیزوں سے مل آؤں، چنانچہ یہ دونوں دوست ایک دوسرے سے علٰحدہ ہوکر اپنی اپنی منزل مقصود پر روانہ ہوگئے۔

جب عامر وادی تیم میں پہونچا تو اس کے قوم کے لوگ بہت خوش ہوئے کیونکہ وہ اس کو مردہ تصور کرچکے تھے یہ وہ زمانہ تھا جب حریف صلاح الدین فوجیں جمع کرکے طبریہ پہونچکر مسلمانوں کی کمک کے لئے پہونچنا چاہتا تھا۔

اُدھر فلپ جب عکا پہونچا تو وہاں بھی مسیحی فوجیں طبریہ پر حملہ کی تیاریاں کررہی تھیں اور اس طرح جب یہ دونوں پھر شرکت جنگ کرنے پر مجبور ہوگئے، تو انھوں نے چاہا کہ ایک دوسرے سے مل لیں اور اس ارادہ سے یہ دونوں اپنی اپنی جگہ سے چل کھڑے ہوئے اور راستہ میں دونوں کی مڈبھیڑ ہوگئی۔

سلطان صلاح الدین جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے اور عزم کرچکا ہے کہ جس طرح ممکن ہوگا وہ صلیبیوں سے تمام اماکن مقدسہ کو پاک کرکے رہیگا۔ چنانچہ اس نے اعلان جہاد کرکے ہر چہار طرف سے مجاہدین کو جمع کرنا شروع کردیا۔

کامل ایک سال کا زمانہ گزرچکا ہے اور جنگ پوری قوت کے ساتھ جاری ہے اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر، واریوں میں، قلعوں کے اندر و باہر عکا سے اور شلیم تک اور نابلس سے کرک تک ہر جگہ خون سے رنگین نظر آتی ہے۔

جب سلطان کو معلوم ہوا کہ مسیحیوں کی ایک تازہ فوج سمندر عبور کرکے آرہی ہے تو اس نے ایک لشکر زین الدین دارم کی قیادت میں حلب سے، دوسرا لشکر قیماز النجمی کی سیادت میں دمشق سے تیسرا مظفر الدین کوکی کی قیادت میں اطراف صحرا سے طلب کرکے شہر طبریہ پر پوری قوت سے حملہ کردیا۔

اس طرف صلیبیوں کی طرف سے بھی مدافعت کی پوری تیاریاں تھیں اس لئے مسلمانوں کے ساحل بحر تک پہونچنے سے پہلے ہی دونوں لشکروں کا تصادم ہوگیا۔ یہ سنیچر کا دن تھا اور ۵۸۲ھ کے ربیع الثانی کی ۲۵ تاریخ۔

دونوں فریق کی جنگ کا اسوقت یہ انداز تھا جیسے شیر آپس میں لڑرہے ہوں۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک جانتا تھا کہ ارض مقدس کے فیصلہ کا قبضہ اسی جنگ پر منحصر ہے۔ گردنوں سے سر کٹ کٹ کر گر رہے تھے تیر پر تیر سینوں میں آکر پیوست ہورہے تھے، لاشوں پر لاشیں گرتی جارہی تھیں اور خون نہروں کی طرح

ہر چہار طرف بپا رہا تھا۔ آخر کار کئی گھنٹے تک یہ قیامت خیز ہنگامہ جاری رہنے کے بعد مسیحی فوجوں نے گھٹنے ٹیک دیئے اور اُن کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ اس جنگ میں پیادہ و سوار ۸۰ ہزار صلیبیوں نے شرکت کی تھی بس میں سے سوائے چند ہزار کے سب کام آ گئے اور بقیتہ السیف نے پناہ طلب کر لی۔

صلاح الدین ۔۔ "اے عامر اس قیدی کو لیکر تو کیا کرے گا"

عامر ۔۔ "اے مولیٰ، آپ کو یاد ہوگا کہ میدان قتال میں جب میں آپ کے سامنے سے گزرا اس حال میں کہ میری تلوار خون سے رنگین تھی تو آپ نے وعدہ کیا تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد آپ میری ایک تمنا ضرور پوری کریں گے، چنانچہ اب میں وہی تمنا پیش کرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ صلاح الدین نے آج تک عہد شکنی کبھی نہیں کی"

صلاح الدین ۔۔ "اے عامر تو اس قیدی کی جاں بخشی چاہتا ہے جس نے میدان جنگ میں صلاح الدین کی گردن جدا کرنا چاہی تھی"

عامر ۔۔ "اے آقا، اگر یہ کوئی معمولی سپاہی ہوتا تو میں کچھ نہ کہتا لیکن یہ شخص صلیبیوں کا بڑا مشہور جری سردار ہے اور ایک بار میری جان بچا چکا ہے۔ اس لئے میرا فرض ہے کہ آج میں اسکی جان بچاؤں۔

سلطان صلاح الدین نے حکم دیا کہ قیدی لایا جائے چنانچہ فلپ سامنے لایا گیا اور صلاح الدین نے اس سے مخاطب ہو کر کہا:۔ "اے سردار میں تیری جاں بخشی کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ تو میرے اس احسان کو کبھی فراموش نہ کریگا"

فلپ نے کہا "اے سلطان میں جانتا ہوں کہ میری جاں بخشی کا سبب عامر ہے اور اگر وہ میرا شفیع نہ ہوتا تو آپ ضرور مجھے قتل کر دیتے، اس لئے میرے شکریہ کا مستحق اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف عامر"

صلاح الدین نے جواب دیا۔ "یہ تو نے صحیح کہا کہ عامر نہ ہوتا تو میں یقیناً تجھے قتل کرا دیتا، لیکن اب تیرے جواب سے معلوم ہوا کہ واقعی تو شجاع انسان ہے اس لئے آ اور میرے اس ہاتھ ملا جو سوائے ایک شجاع انسان کے کسی اور کے لئے آج تک آگے نہیں بڑھا۔ میں نہ صرف تیری جاں بخشی کرتا ہوں بلکہ تجھے آزادی بھی دیتا ہوں۔ اے میرے عزیز جا اور ایک آزاد بھائی کی سی زندگی بسر کر" ۔۔ چنانچہ عامر نے اپنے خاندان سے علٰحدہ ہو کر اور فلپ نے اپنی قوم سے جدا ہو کر زہد و اتقا کے کامل تین سال ایک ساتھ حرا کے پہاڑ میں بسر کر دئے۔

جبل زیتون کی بلندی پر ایک گھنا سایہ دار درخت ہے جس کے نیچے دو قبریں نظر آتی ہیں جن میں سے ایک پر پتھر نصب ہے اور دوسری پر لکڑی کی صلیب ۔۔ یہ قبریں عامر اور فلپ کی ہیں جنھوں نے مذہب کے نام پر تو ایک دوسرے کے خلاف تلوار اٹھائی، لیکن انسانیت کے نام پر دونوں نے ملکر ساتھ ہی جان دی۔

سوئٹزرلینڈ کا وفاقی آئین

وفاقی نظام حکومت کے عناصر

۴ - حکومت عوام

اب تک ہم نے سوئٹزرلینڈ کی وفاقی حکومت کے ان حصوں سے بحث کی تھی۔ جن کی نظیر دیگر دستوری ملکوں کے آئین میں بھی ملتی ہیں۔ مگر اب ہم ایک ایسے آئینی ادارے کا ذکر کرتے ہیں جو سوئٹزرلینڈ کی سرزمین کے ساتھ مخصوص ہے اور جسے بجا طور پر اس ملک کا دلچسپ ترین دستوری کارنامہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس نے سوئٹزرلینڈ کے نظام حکومت پر، جو اسوقت ہمارے پیش نظر ہے، بڑا گہرا اثر ڈالا ہے اور اب تمام دنیا میں رائے عامہ کو اپنی افادیت سے متاثر کر رہا ہے۔ ہماری مراد اس چیز سے ہے جسے "بلاواسطہ حکومت عوام" کہتے ہیں۔ یعنی عوام کا براہ راست ملک پر حکومت کرنا۔ "حکومت عوام" کے دو جزو ہیں۔ ایک ریفرنیڈم (Referendum) یعنے رائے عامہ حاصل کرنے کا قانون اور دوسرا انی شیٹو (Initiative) یعنی عوام کی قانون سازی۔

سوئٹزرلینڈ میں بلاواسطہ حکومت عوام کا وجود بہت قدیم (تقریباً سولہویں صدی) سے ہے۔ اس ملک کا آئینی ادارہ جسے (Kanden gemende) یعنے کینٹونوں کی اسمبلی کہتے ہیں "حکومت عوام" ہی کی ایک صورت ہے موجودہ صورت میں حکومت عوام کا آغاز ۱۸۳۰ء سے ہوتا ہے اور اس لئے ہم اسے اُنیسویں صدی کی پیداوار کہہ سکتے ہیں۔ اس کا بنیادی خیال، جسے فرانس کے مشہور مفکر روسو نے لوگوں میں پھیلایا تھا، یہ تھا کہ قانون سازی نمایندوں کے ذریعے سے نہیں ہونی چاہئے بلکہ عوام کو خود کرنی چاہئے۔

۱۸۳۱ء میں ایک سیاسی اسکیم مرتب کی گئی کہ کینٹونوں کی اسمبلیوں کے منظور کردہ قانون کثرتِ رائے سے نامنظور ہو سکتے ہیں۔ رفتہ رفتہ اس دستوری اُصول کو سب کینٹونوں نے قبول کر لیا۔ اور اس کا نام ریفرنیڈم رکھا گیا۔ یہ اصطلاح پُرانے کانفیڈریشن کے دستور سے لی گئی تھی۔ اس دستور کی رو سے ایک کینٹون کے ڈیلیگیٹ کسی تجویز پر اپنی رائے اس وقت تک محفوظ رکھتے تھے جب تک کہ وہ اپنے کینٹون کے اہل الرائے

سے استصواب نہ کر لیتے تھے۔

ریفرینڈم کے لازمی عناصر یہ ہیں :- (۱) ایک اسمبلی جو تجربے کے طور پر قوانین کا نفاذ کرتی ہے (۲) ایک ایسا انتظام جس سے مسودے عوام کی رائے حاصل کرنے کے لئے نشر کئے جاتے ہیں۔ (۳) رائے دہندگان کی موافق یا مخالف رائے۔

ریفرینڈم دو قسم کے قوانین پر منقسم ہوتا ہے (۱) دستوری قوانین اور ترمیمات (۲) معمولی قوانین۔ گیارہ کینٹونوں میں ریفرینڈم لازمی ہے یعنے ان کینٹونوں میں اسمبلی کا منظور کردہ ہر قانون رائے عامہ کے لئے نشر کیا جاتا ہے۔ ان سات کینٹونوں میں ریفرینڈم اختیاری ہے یعنے رائے دہندگان کی ایک معینہ تعداد کے مطالبے پر قانون نشر کیا جاتا ہے۔ ان سات کینٹونوں میں سے بعض میں معینہ تعداد کا تناسب سات بعض میں بارہ اور بعض میں پندرہ فیصدی ہے۔ قانون منظور ہونے کے بعد تیس دن کے اندر اندر کینٹون کی ایگزکٹو کونسل کے سامنے نشر قانون کی درخواست پیش ہو جانی چاہئے۔

کانفیڈریشن اور کینٹونوں میں ریفرینڈم کے شرائط اور طریقے

کانفیڈریشن میں وفاقی دستور کی تمام تبدیلیوں پر ریفرینڈم ضروری ہے۔ مگر اس قسم کے ریفرینڈم کی منظوری کے لئے نہ صرف رائے دہندوں کی اکثریت ضروری ہوتی ہے بلکہ کینٹونوں کی اکثریت بھی درکار ہوتی ہے۔ اسی طرح ان تمام وفاقی تجاویز اور قانونوں کے سلسلے میں بھی جو عمومی ہوتے ہیں اور جن کے متعلق اسمبلی کی طرف سے "اشد ضروری" ہونے کا اعلان نہیں ہوتا، ریفرینڈم اسوقت ممکن ہو جاتا ہے جب کم از کم تیس ہزار شہری یا کم سے کم آٹھ کینٹون ریفرینڈم کا مطالبہ کریں۔

"اشد ضروری" تجاویز اور قوانین، جن کا نشر ضروری خیال نہیں کیا جاتا، وہ ہنگامی تجاویز اور قوانین ہوتے ہیں جو کسی خاص موقعہ کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ صلحنامے (معدودے چند کو چھوڑ کر) سب کے سب ریفرینڈم کے ماتحت عمل میں آتے ہیں۔ البتہ سالانہ میزانیہ اور انتظامی امور کے لئے ریفرینڈم کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔

کینٹونوں میں عام طور پر دستور اساسی کی تبدیلیوں پر ریفرینڈم ہوتا ہے اور کینٹونوں کی اسمبلیوں کے منظور کردہ قوانین بھی رائے عامہ کے لئے نشر کئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے گیارہ کینٹونوں میں تمام تجاویز اور قوانین ریفرینڈم کے حوالے سے ہوتے ہیں۔ سات دیگر کینٹونوں میں رائے دہندگان کی ایک معینہ تعداد کے مطالبے پر ریفرینڈم ہوتا ہے۔ تین کینٹون ایسے ہیں جہاں ریفرینڈم کے سلسلے میں مختلف قوانین میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ بعض عوام کے مطالبے کے بعد ہی ریفرینڈم کے سپرد ہوتے ہیں اور بعض بلا مطالبہ

بھی نشر کر دئے جاتے ہیں۔ ایک کینٹون (فری بورگ) ایسا ہے جس میں قوانین پر کوئی ریفرینڈم نہیں ہے۔ نیز وہ کینٹون بھی جو (عوام کی اسمبلی) کے زیرِ حکومت ہیں، ریفرینڈم سے بے نیاز ہیں۔

مندرجۂ بالا بیان سے یہ معلوم ہوا کہ قوانین پر رائے عامہ حاصل کرنے کے معاملے میں کانفیڈریشن اس حد تک نہیں جاتا جس حد تک کینٹون جاتے ہیں۔ کیونکہ کانفیڈریشن کے قوانین صرف اسی وقت نشر کئے جاتے ہیں جب تیس ہزار رائے دہندگان یا آٹھ کینٹون اس کا مطالبہ کریں مگر کینٹونوں میں سب کے سب کینٹون اور خصوصیت کے ساتھ سات کینٹون کم و بیش سبھی قوانین کو ریفرینڈم کے حوالے کرتے ہیں۔ مگر ایک بات فراموش نہ کرنی چاہیے کینٹونوں میں سے ہر ایک کے لئے کانفیڈریشن جیسے وسیع ادارے کی بہ نسبت یہ زیادہ آسان ہے کہ وہ عوام کی رائے حاصل کرلے۔ کیونکہ اس کے سامنے صرف چند ہزار افراد سے رائے لینے کا سوال ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے کہ کانفیڈریشن کا دائرۂ اختیار بہت وسیع ہے اور اسے رائے کے حصول میں بعض رکاوٹوں کو دور کرنا ہوتا ہے۔

کانفیڈریشن میں ریفرینڈم کا طریقہ یہ ہے کہ ہر قانون اسمبلی میں منظور ہو چکنے کے بعد سرکاری اخبار میں شائع ہوتا ہے اور کینٹونوں کو بھیجا جاتا ہے تاکہ کمیونوں کے ذریعہ اس کی اشاعت ہو جائے۔ منظور ہو چکنے کے نوے دن بعد سے قانون پر عملدرآمد شروع ہوتا ہے۔ نوے دن کے اس عرصے میں آٹھ کینٹون یا تیس ہزار شہری ریفرینڈم کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ کینٹونوں کی طرف سے مطالبہ بہت ہی کم ہوتا ہے۔ منظور شدہ قانون کے مخالفین عوام کے دستخط جمع کرنے شروع کر دیتے ہیں۔ اگر قانون کی مخالفت میں کوئی دلچسپی نہ لی جا رہی ہو تو مخالفین کو معینہ تعداد میں دستخط حاصل کرنے کے لئے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے اور اس غرض کے لئے انجمنیں ترتیب دی جاتی ہیں۔ جن مقامات کی آبادی عقیدے کے لحاظ سے رومن کیتھولک ہے وہاں پادری لوگ خوب کام دیتے ہیں۔ مگر ان کینٹونوں میں جو پروٹسٹنٹ ہیں مذہبی رہنماؤں کی امدادی کارروائیاں کچھ زیادہ مفید ثابت نہیں ہوتیں کیونکہ ان کے گرجاؤں میں لوگ کم جمع ہوتے ہیں۔

بعض اوقات دستخط جمع کرنے کے لئے ایجنٹ بھی بھیجے جاتے ہیں اور ان کو بیس سنٹائم فی دستخط کے حساب سے معاوضہ دیا جاتا ہے۔ ایجنٹوں کے ذریعے سے دستخط حاصل کرنے میں ایک بڑی قباحت یہ ہے کہ اکثر دستخط مشتبہ سمجھے جاتے ہیں اور بعض اوقات ہزاروں نام اس لئے کاٹ دئے جاتے ہیں کہ یا تو وہ ایک ہی وضع کے خط میں لکھے ہوتے ہیں یا کمیون کے صدر کو ان کی تصدیق کے لئے کافی وجوہ نہیں ملتے۔ فیڈرل کونسل نے فیصلہ کر دیا ہے کہ ان پڑھ شہری اپنے دستخطوں کی جگہ نشان بنا سکتے ہیں مگر چونکہ دستخط کرنے کا حق شہریت ہی کا ایک جزو ہے اس لئے وہ کینٹون کے قانون ہی کے ماتحت آتا ہے۔

مرسلہ دستخطوں کی تعداد کو کافی تسلیم کر لینے کے بعد فیڈرل کونسل کینٹونوں کی کونسلوں کو مطلع کرتی ہے، تمام ملک میں قانون کی اشاعت کرتی ہے اور ووٹنگ کے لئے دن مقرر کرتی ہے۔ عموماً ووٹنگ نشر و اشاعت کے چار ہفتے بعد ہوتا ہے۔

اب قانون کی اہمیت کے اعتبار سے ایجی ٹیشن شروع ہوتا ہے۔ اگر عوام قانون سے زیادہ دلچسپی لیتے ہیں اور سیاسی پارٹیوں کے نزدیک بھی اسے اہمیت حاصل ہوتی ہے، تو اس صورت میں ایجی ٹیشن بہت ہمہ گیر ہوتا ہے ورنہ محدود حیثیت اختیار کرتا ہے۔

مسودۂ قانون کی ایک ایک کاپی ہر ووٹر کو بھیجی جاتی ہے۔ مگر اس کاپی کے ساتھ سرکاری میمورنڈم نہیں ہوتا جلسے منعقد ہوتے ہیں اور ان جلسوں میں ممبران اسمبلی اور دیگر اہل الرائے قانون کی مخالفت یا موافقت میں پرزور اور مدلل تقریریں کرتے ہیں۔ اخباروں کے صفحات قانون کی موافقت یا مخالفت سے لبریز نظر آتے ہیں ووٹ کی پرچیاں اور قانون کے مسودے کی نقلیں فیڈرل گورنمنٹ کی طرف سے مہیا کی جاتی ہیں مگر ووٹنگ کے انتظامات کینٹونوں کے ذمہ دار افسران ہی کے ہاتھوں میں رہتے ہیں۔ تمام ملک میں ایک ہی دن ووٹ پڑتے ہیں۔ عموماً یہ اتوار کا دن ہوتا ہے۔ ووٹنگ کے دوران میں کامل امن و سکون رہتا ہے اور آج تک فریب یا عیاری کی کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ چونکہ قانون کے مسودے کی کاپیاں جرمن، فرانسیسی اور اطالوی تینوں زبانوں میں بانٹی جاتی ہیں اور چھ لاکھ سے زیادہ کاپیوں کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے ووٹنگ پر بہت کافی خرچ آتا ہے۔

کینٹونوں میں سے اُن کینٹونوں میں جہاں ہر قانون کا نشر کیا جانا لازمی ہے، اسمبلی کی منظوری کے بعد دستخط حاصل کرنے کا ابتدائی مرحلہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے بلکہ یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ یا تو قانون کی منظوری کے فوراً بعد یا اسمبلی سیشن کے اختتام پر ووٹنگ کا دن مقرر کر دیتے ہیں اور مسودۂ قانون کی ایک ایک نقل ہر شہری کو بھیج دی جاتی ہے۔ اس نقل کے ہمراہ ایک قسم کی تشریحی دستاویز بھی ہوتی ہے تاکہ ہر رائے دہندہ کو قانون کے متعلق مکمل معلومات مہیا کر دی جائیں۔ یہ دستاویز ایک قسم کی سفارشی تحریر ہوتی ہے مگر ایک کینٹون میں جہاں ایگزیکٹو کونسل عوام کی منتخب کردہ اور گریٹ کونسل کے اثرات سے آزاد ہوتی ہے، وہ قانون کے ساتھ سفارشی دستاویز بھیجنے کی بجائے اُس پر مخالفانہ نکتہ چینی بھی کرتی ہے۔

کانفیڈریشن کے ووٹنگ کی طرح کینٹونوں کے ووٹنگ سے پہلے بھی خوب گرما گرم بحثیں اور تقریریں ہوتی ہیں اور لوگ ان میں بڑے شوق اور بڑی دلچسپی کے ساتھ حصہ لیتے ہیں۔ اخبارات بھی اظہار رائے میں بڑی سرگرمی دکھاتے ہیں۔ سوئٹزرلینڈ میں ہر طبقے کے ترجمان اخبارات موجود ہیں اور اگر رقبے کے لحاظ سے

دیکھا جائے تو یوروپ کا کوئی ملک اخباروں کی کثرت تعداد میں سوئٹزرلینڈ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

جن کینٹونوں میں ریفرینڈم اختیاری ہے، وہاں کینٹون کی کونسل عوام کے مطالبے کا انتظار کئے بغیر ہی اپنے منظور کردہ قوانین میں سے بعض کو نشر کردیتی ہے۔ بعض کینٹونوں میں کونسل کی ایک معینہ اقلیت کسی قانون ریفرینڈم کا مطالبہ کرے، اسی وقت اس قسم کا اقدام کیا جاتا ہے۔

اس اعتبار سے ان کینٹونوں میں جہاں ہر قانون پر رائے عامہ حاصل کی جاتی ہے، شہریوں کے لئے قانون سازی کے وبال جان بن جانے کا بہت شدید امکان ہے۔ اس دشواری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے یہ صورت اختیار کی جاتی ہے کہ بیشتر کینٹون سال میں دو مواقع ووٹنگ کے لئے مخصوص کردیتے ہیں۔

سید نجم الدین احمد جعفری بار ایٹ لا

"نگار" جنوری ۳۷ء

اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل جدید چیز ہوگا اور مفید ہونے کی حیثیت سے حد درجہ اہم۔ علوم و فنون اور ادب و انشار کے تعلق اتنے مفید اور دلکش مضامین کا مجموعہ مشکل ہی سے آپ کو کہیں اور نظر آسکتا ہے۔

"ڈراما اصحاب کہف" بھی مکمل اسی میں شایع ہوگا اور "مسئلۂ خلافت و امامت" پر بھی ایک بسیط مضمون شیعی نقطۂ نظر سے آپ کو اس میں نظر آئے گا۔ علاوہ اس کے اور مضامین بھی ادارۂ تحریر کی طرف سے پیش کئے جائیں گے۔ حجم ۱۶۰ صفحات۔ غیر خریداران نگار سے قیمت معہ محصول فی کاپی ایک روپیہ (عہ)

منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

ادب و انشار کی دنیا میں وہ چیز جسکی مثال آپ کو اردو زبان میں مل ہی نہیں سکتی۔ طنزیات و محاکات، شوخی و رنگینی سلاست و بیساختہ پن، لطیف و پاکیزہ اشعار کا محل استعمال، جذبات کی پاکیزگی، طرز ادا کی ندرت اگر آپ ان تمام خوبیوں کو یکجا دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو صرف "مکتوبات نیاز" میں نظر آئیں گی۔ اس میں حضرت نیاز کی تازہ تصویر بھی شامل ہے اور ان کی تحریر کا بلاک بھی۔ ضخامت ۲۸۸ صفحات، کاغذ دبیز۔ قیمت معہ محصول ۱۴ع۔ کتاب مجلد شایع ہوئی ہے۔

منیجر نگار۔ لکھنؤ

متمدن دُنیا کے غیر متمدن انسان

نامی نے کہا۔ "میں بہت سویرے اسپتال پہونچ جاتا ہوں۔ مریض آٹھ بجے سے پہلے آنے شروع نہیں ہوتے۔ خالی بیٹھا رہتا ہوں، یا طبّی رسائل کی ورق گردانی کیا کرتا ہوں۔ تم سات بجے وہیں آنا، باتیں کرینگے۔"

میں دوسرے دن سات بجے اسپتال پہونچ گیا۔ بہت دیر نامی سے گفتگو ہوتی رہی۔ پھر وہ اُٹھکر کسی کام سے دوسرے کمرے میں گیا۔ اسپتال کی فضا سے مجھے یوں بھی وحشت ہوتی ہے۔ جب اس کے آنے میں دیر ہوئی تو میرا جی گھبرانے لگا۔ باہر نکل آیا اور کھلی ہوا میں ٹہلنے لگا۔ صبح کا وقت ہر جگہ ہر موسم میں خوشگوار ہوتا ہے، پھر یہ تو پہاڑ تھا اور اپریل کے دن۔ یہاں کی صبح کا کیا کہنا۔ کوہستانی مناظر نہایت دلکش تھے۔ ہوا میں نکھار اور تازگی پائی جاتی تھی۔ سبزہ جو اس رنگین دُنیا کے گوشے گوشے پر قابض تھا آنکھوں میں کھپا جاتا تھا لیکن ٹھیک اسی وقت ۔۔ میری نظریں ایک تکلیف پہونچانے اور دل دُکھانے والے منظر سے دوچار ہوئیں یعنی دو پہاڑی قُلی اپنے کاندھوں پر ایک ڈانڈی اُٹھائے ہوئے آئے۔ جس جگہ میں ٹہل رہا تھا وہیں انھوں نے ڈانڈی کو رکھدیا اور پاس کھڑے ہو گئے۔ میں نے ان پہاڑی قلیوں کو دیکھا اور ۔۔۔ خوشی کے اُبلتے ہوئے جذبات دک گئے، مسرت کے پھوٹتے ہوئے چشمے پر کسی نے ایک بھاری پتھر لاکر ڈال دیا۔

ایک شخص ہے، نوعمر، تندرست و توانا۔ جوانی کا خون اُس کی رگوں میں اُچھل رہا ہے۔ جسم شیشے کی طرح چمکتا ہے۔ صحت و قوت اعضا سے ٹپکتی ہے۔ ایک دن وہ ٹھوکر کھا کے گر پڑتا ہے۔ پاؤں میں چوٹ آتی ہے۔ زخم ہو جاتا ہے۔ اب اس زخم کی تکلیف اُس کے احساس توانائی پر غالب آجائے گی۔ اُس کا دماغ رگوں میں اُچھلتے ہوئے خون کی روانی اور فراوانی کی طرف توجہ نہ کر سکے گا، بلکہ اُس درد اور کرب سے لبریز ہو جائے گا جو پاؤں کے زخم سے پیدا ہو رہا ہے۔

ایک خوش نصیب انسان ہے۔ دنیا اور زندگی کی ہزاروں نعمتیں اس کو حاصل ہیں۔ وہ ہر وقت خوش رہتا ہے۔ کامرانیاں اور فتحمندیاں اسے مسرور رکھتی ہیں۔ ایک صبح وہ ایک خبر سنتا ہے جو اُس کے لئے نہایت غمناک ہے۔ اب اُس کی ساری کامرانیاں اور فتحمندیاں اُسے خوش کرنے میں کامیاب نہوں گی، لیکن یہ

ایک غمناک خبر اس کی ساری زندگی کو تلخ بنانے میں کامیاب ہو جائے گی۔

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ تکلیف خواہ کتنی ہی خفیف ہو، راحت کے شدید سے شدید احساس پر غالب آجاتی ہے۔ چنانچہ میں جب پہاڑ پر ہوتا ہوں تو اپنے آپ کو رنگینیوں اور رعنائیوں میں گھرا ہوا پاتا ہوں، میرے گرد و پیش کا حسن میرے دل و دماغ کو خوشی و مسرت کے لطیف ترین جذبات سے معمور کر دیتا ہے۔ لیکن پھر جب کسی پہاڑی مزدور کا چہرہ سامنے آجاتا ہے تو ساری رنگینیاں اور رعنائیاں دل سے محو ہو جاتی ہیں، قدرتی مناظر کی خوبصورتی کا احساس دماغ سے زائل ہو جاتا ہے، خوشی اور مسرت کے جذبات فنا ہو جاتے ہیں، اور میں ایک پوشیدہ لیکن روح فرسا اذیت میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ یہ سوچنے لگتا ہوں کہ انسان فطرت کا ایک جزو ہوتے ہوئے بھی فطرت سے کسقدر بعید ہے۔ ایک طرف فطرت ہے، شاداب، بھرپور اور چھلکتی ہوئی۔ دوسری طرف انسان ہے، بھوکا، ننگا اور مصیبت زدہ۔ ایک طرف بالیدگی، فراوانی اور فیاضی ہے، دوسری طرف احتیاج، محرومی اور ناداری۔ فطرت کے چہرے پر ایک لازوال تبسم کی شگفتگی ہے، انسان کی آنکھوں میں دُکھ اور تکلیف کے ختم نہ ہونے والے آنسو۔

یہ دو پہاڑی مزدور جو اسوقت میری نظروں کے سامنے تھے اپنے طبقے کے بہترین نمائندے تھے۔ اُن کے بھدے اور بوسیدہ لباس کو انسانی لباس کہنا گویا انسانوں کا مذاق اُڑانا تھا۔ اُن کے چہروں میں کچھ ایسی وحشت تھی کہ وہ انسان کم اور حیوان زیادہ معلوم ہوتے تھے۔ اُن میں اور جانوروں میں بظاہر یہی فرق نظر آتا تھا کہ وہ منہ سے بول سکتے تھے اور جانور نطق سے محروم ہوتے ہیں۔ اُن کو دیکھ کر میری آنکھوں کے سامنے ہزاروں برس پہلے کے انسان کی تصویر کھنچ گئی، اُس انسان کی جو وحشی اور غیر متمدن تھا اور جس نے آدمیت کی ساری منزلیں طے نہیں کی تھیں۔ لیکن میں نے ابھی صرف اُن کی ظاہری اور جسمانی ہیئت پر غور کیا تھا۔ تھوڑی دیر میں مجھ پر یہ حقیقت واضح ہونے والی تھی کہ وہ ذہنی اور دماغی اعتبار سے بھی اس متمدن، مہذب اور ارتقائی زمانے سے ہزاروں برس پیچھے ہیں۔

مزدوروں نے ڈانڈی کو زمین پر رکھ دینے کے بعد جب اس کا پردہ اُٹھایا تو میں نے دیکھا کہ ڈانڈی میں جس شخص کو ڈال کر لائے ہیں اتفاق سے وہ اُن لوگوں میں سے نہیں ہے جن کے لئے ڈانڈیاں مخصوص ہیں بلکہ خود اُسی طبقے سے تعلق رکھتا ہے جن کے لئے ڈانڈیاں اُٹھانے کی خدمت مخصوص ہے۔ یعنی وہ بھی ایک مزدور ہے۔ اور اپنے عزیزوں یا دوستوں کے کاندھوں پر سوار ہو کر اسپتال میں علاج کے واسطے آیا ہے۔ جس طرح نامی کام میں لگا ہوا تھا اُسی طرح دوسرے ڈاکٹر بھی اندر مصروف تھے۔ چنانچہ ان لوگوں کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ سامنے سورج بلند ہو رہا تھا اور اُس کی شعاعوں کی تیزی بڑھ رہی تھی جو شاید مریض کو ناگوار تھی۔ اسلئے مزدوروں نے پردہ پھر ڈال دیا۔

چند منٹ کے بعد اندر سے کوئی ڈاکٹر آیا۔ اُس نے پوچھا "کیا بیمار ہے؟" مزدوروں نے جواب میں پردہ ہٹا کر مریض کو دکھایا۔ میری اور ڈاکٹر کی نظریں بیک وقت اُس پر پڑیں۔ اُس کے چہرے سے زندگی کے آثار غائب ہو چکے تھے اور آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ "یہ تو مردہ ہے" ڈاکٹر نے کہا۔ مزدور اُس کا منہ تکنے لگے۔ "لے جاؤ اسے یہاں سے، یہ مر چکا ہے" ڈاکٹر یہ کہکر اندر چلا گیا۔

ابھی آٹھ نہیں بجے تھے اور مریض آنے شروع نہیں ہوئے تھے۔ میں اکیلا زندگی اور موت کے اس ہنگامے کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں مزدور بہت گھبرائے ہوئے تھے اور پریشانی کے ساتھ ایک دوسرے کو تک رہے تھے اُن کی پریشانی کی وجہ تو ظاہر تھی، لیکن اُن کے تامل کا سبب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے اُن سے کہا "ارے بھئی یہ مر گیا، اسے گھر کیوں نہیں لیجاتے تم!" میرے کہنے پر بھی اُن دونوں نے چاروں طرف ایک گھبرائی ہوئی نظر ڈالی اور جلدی سے جُھک کر مرے ہوئے آدمی کے پاؤں جھنجھوڑے اور اُس کا نام لیکر پکارا۔ اب مجھے اُن کے پس وپیش کی وجہ معلوم ہوئی۔ اُن کو مریض کی موت کا یقین نہ آتا تھا، بالکل اسی طرح جس طرح ایک نادان بچے کو یقین نہ آتا۔ لیکن بچے کی ذہنیت بھی تو اصل میں غیر متمدن انسان ہی کی ذہنیت ہوتی ہے۔

آہ! پہاڑ کے مزدور، متمدن دنیا کے غیر متمدن انسان!!!!

اختر انصاری بی۔اے

بہار

مولفہ الیاس احمد ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی منصف سہارنپور

گلدستہ "بہار" فارسی اور اُردو شعراء کے چوٹی کے کلام خصوصاً غزلوں کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے یا یوں سمجھئے کہ شعراء کی پاکیزہ زبان میں حُسن وعشق کی مکمل داستان ہے۔ اس داستان کے آغاز عشق سے لیکر انجام عشق تک جتنے عنوانات قائم ہو سکتے ہیں، قائم کئے گئے ہیں اور ہر عنوان کے تحت میں چیدہ چیدہ اور متحد المضامین اشعار درج ہیں عنوانات سیکڑوں ہیں۔ اس گلدستہ کے ہوتے ہوئے شاید ہی کسی کے دیوان کی ضرورت ہو۔ علم وادب میں یہ گلدستہ ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مصرعہ:۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔

اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت معہ محصول ڈاک عہ ضخامت ۲۳۶ صفحات

ملنے کا پتہ:۔ منیجر صاحب۔ دارالمصنفین۔ اعظم گڈھ۔ یو۔پی

موت کا انتظار

گزشتہ جنگ عظیم کے دوران میں پانچ عورتیں امریکہ کے ایک گھڑی سازی کے کارخانہ میں نوکر تھیں انکا کام یہ تھا کہ وہ گھڑیوں کے خول صاف کیا کریں۔ اس غرض کے لئے انھیں ایک مسالہ دیا گیا تھا جسے برش پر لگا کر خول کو رگڑتی تھیں۔ اس عمل کے دوران میں کبھی کبھی انھیں برش اپنے لب سے تر بھی کرنا پڑتا تھا چونکہ اس مسالہ میں ریڈیم کے بھی کچھ اجزا شامل تھے اس لئے رفتہ رفتہ ان کے خون میں زہر پھیل گیا اور ڈاکٹروں نے کہدیا کہ وہ ایک سال سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتیں۔

کارخانے نے ان میں سے ہر ایک کو دس ہزار ڈالر نقد ادا کئے اور پچاس ڈالر ماہوار وظیفہ مقرر کر کے ان کو خدمت سے سبکدوش کر دیا۔ اس کے علاوہ مصارف علاج ادا کرنے کی بھی ذمہ داری اپنے سر لی۔

ان میں سے چار سال کے اندر ہی اندر مر گئیں۔ ایک جس کا نام کیتھرائن تھا وہ دو سال اور زاید زندہ رہی لیکن اس یقین کے ساتھ کہ موت کا چنگل اس سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔

ہمارے یہاں اگر کسی کو معمولی مرض بھی لاحق ہو جاتا ہے تو وہ اس سے مغلوب ہو کر ہاتھ پاؤں چھوڑ بیٹھتا ہے، لیکن اس خاتون کا فلسفہ یہ تھا کہ مرنا تو بہر حال لازم ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس تھوڑے سے وقت کی قدر نہ کیجائے، چنانچہ اس نے لکھنا پڑھنا سیکھا اور ایک کتاب تصنیف کی جس میں اس نے اپنے تمام حالات قلمبند کئے۔ ہم اس جگہ حصہ کتاب کے بعض اقتباسات پیش کرتے ہیں جو حقیقتاً افسانہ سے زیادہ دلچسپ ہیں۔ لکھتی ہے کہ :-

"جسوقت مجھے اور میرے ساتھ کام کرنے والی چار خاتونوں کو کارخانہ سے معاوضہ دیکر رخصت کیا گیا تو اخبارات کے نمایندوں نے آکر پوچھنا شروع کیا کہ اس دولت کا مصرف ہم لوگوں نے کیا سوچا ہے اور عمر کے باقی چند دن کیونکر بسر کرنیکا ارادہ ہے۔

میں نے اپنے نفس سے یہی سوال کیا تو اس نے جواب دیا کہ عمر کی اس تھوڑی سی مہلت کا بہترین مصرف یہی ہو سکتا ہے کہ لوگوں کی خدمت میں اسے صرف کر دیا جائے۔ چنانچہ میں نے اپنے باپ کو دو ہزار ڈالر دئے تاکہ وہ اپنے مکان کا فک رہن کرائے اسی کے ساتھ سود اور ٹیکس کی جو رقم اس پر واجب تھی وہ بھی میں نے ادا کی۔ اس فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد میں نے ایک خاص قسم کی مسرت محسوس کی اور اپنی آسایش و

راحت کی طرف متوجہ ہوئی - چنانچہ میں نے خوبصورت فرنیچر، سامان تفریح، قیمتی لباس، عمدہ عمدہ ٹوپیاں، جوتے، موزے وغیرہ خریدے اور نہایت راحت و آرام سے زندگی بسر کرنے لگی - میں نے کوشش کی کہ سوائے اس لمحہ کے جو گزر رہا ہے، ماضی و مستقبل کا خیال تک دل میں نہ آئے، اور عمر کی اس ایک سال کی مدت میں کوئی حرکت مجھ سے ایسی سرزد نہ ہو جس پر میرا ضمیر ملامت کرے - اسی کے ساتھ میں نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ جو جی چاہیگا کرونگی اور جتنی عیش و تفریح ممکن ہے اسے ہاتھ سے نہ جانے دوں گی -

میرے مکان سے کچھ دور ایک مدرسہ تھا، جہاں ایام گرما میں لڑکیوں اور عورتوں کو گھوڑے کی سواری، تیرنا، ٹینس کھیلنا اور اسی طرح کے تمام ورزشی کھیل سکھائے جاتے تھے - ہرچند میں خود ان چیزوں میں کوئی عملی حصہ نہ لے سکتی تھی لیکن اور عورتوں کو مشق کرتے ہوئے دیکھتی تھی اور خوش ہوتی تھی - اول اول تو میں پیدل جایا کرتی تھی لیکن پھر ضعف کی وجہ سے سواری پر جانے لگی -

اس کے بعد میں دور سٹبرا چلی گئی اور یہاں کے مناظر صحرا وغیرہ سے لطف اٹھانے لگی - اسی زمانہ میں میں نے ایک موٹر خریدا اور اسے چلانا سیکھا، لیکن کچھ دنوں کے بعد میں نے ایک موٹر چلانے کے لئے عورت کی خدمات حاصل کیں، کیونکہ اب میں زیادہ نحیف ہو گئی تھی -

میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ ماضی کا خیال بھی دل میں نہ لاؤں گی اور نہ مستقبل کی فکر کرونگی لیکن اسی دوران میں میری تین ساتھی عورتیں مر گئیں اور بے اختیار مجھے اپنی موت بھی یاد آنے لگی - جب سال ختم ہونے کے قریب آیا تو مجھے لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا - میں نے اسوقت تک سوائے ابتدائی تعلیم کے اور کچھ حاصل نہ کیا تھا - چنانچہ میں نے کولمبیا یونیورسٹی کو لکھا اور تحریری اسباق کے ذریعے سے میں نے انگریزی زبان میں مہارت حاصل کرنا شروع کی - اسی زمانہ میں میرے ایک دوست نے مشورہ دیا کہ میں اپنی زندگی کے حالات لکھوں چنانچہ ساتھ مہینے میں انگریزی زبان کے تمام اسباق ختم کر کے میں نے اپنے حالات پر ایک تصنیف شروع کر دی -

اسی دوران میں مجھ پر وجع مفاصل نے حملہ کیا اور مجھے مہینوں اسپتال میں رہنا پڑا - اس مرض کے زمانہ میں بھی میں برابر اپنی تصنیف میں مشغول رہی - لیکن مجھے امید نہ تھی کہ میری عمر اتنی وفا کرے گی کہ یہ کتاب ختم ہو جائے -

اس کے بعد میں ایک اور اسپتال میں داخل ہوئی - یہاں میں نے اپنی تصنیف کو پورا کیا اور اسے شائع کرا دیا -

آئندہ بھی میرا ارادہ تصنیف و تالیف کا ہے اور ہرچند میری موت مجھ سے بہت قریب آگئی ہے، لیکن کوئی وجہ نہیں کہ میں اس کے ڈر سے کام کرنا چھوڑ دوں اور زندگی کے مختصر ایام کو دوسروں کی خدمت کے لئے وقف نہ کر دوں -

باب الاستفسار

سکھ

مذہبی اور تاریخی نقطۂ نظر سے

(جواب سید عبدالغفور صاحب۔ میانوالی)

سکھوں کے عقاید بظاہر ہندوؤں سے بالکل منحلدہ ہیں، لیکن یوں ان کا میلان بہ نسبت مسلمانوں کے زیادہ تر ہندوؤں کی طرف ہے۔ اس کا کیا سبب ہے۔ میں ممنون ہوں گا اگر آپ اس جماعت پر مذہبی و تاریخی نقطۂ نظر سے کچھ لکھنا پسند فرمائیں گے۔

(نگار) سکھوں کا میلان اگر آپ ہندوؤں کی طرف پاتے ہیں تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کیونکہ اپنی معاشرت و تمدن کے لحاظ سے بھی وہ ہندو ہیں اور مذہبی حیثیت سے بھی انہیں اس لئے ہندو کہنا چاہیئے کہ ان کا مسلک ہندو مذہب ہی کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ اور جس طرح بودھ مذہب برہمنوں کے مذہبی استبداد کی مخالفت میں رونما ہوا تھا بالکل اسی طرح سکھ مذہب بھی وجود میں آیا۔

جب دنیا میں مذہب کی سختی و تنگ نظری اس حد تک پہونچ جاتی ہے کہ انسان اپنی ذہنی و دماغی آزادی کھو بیٹھنے کے قریب ہوتا ہے تو ہمیشہ ایک ذی فہم جماعت اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی ہے، چنانچہ مسلمانوں میں بھی یہی ہوا کہ جب اشاعرہ کی سخت گیریاں بڑھیں تو معتزلہ کا گروہ پیدا ہوگیا اور اسوقت بھی مولویوں کے خلاف جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی جدوجہد اسی مذہبی تنگ نظری کا نتیجہ ہے۔

گرونانک جی جو سکھ مسلک کے بانی ہیں، نہایت روشن دماغ انسان تھے اور وہ مذہبی جھگڑوں اور ذات پات کی تفریق کو بری نگاہ سے دیکھتے تھے، وہ تمام انسانوں کو ایک ہی چیز سمجھتے تھے اور ایک ہی رشتۂ اخوت

سے وابستہ دیکھنا چاہتے تھے۔

آپ لاہور کے قریب تلونڈی میں (جسے اب ننکانا کہتے ہیں) ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوئے اور ہر چند ظاہری تعلیم آپ نے زیادہ حاصل نہیں کی، لیکن قدرت کی باطن تعلیم سے آپ پوری طرح آراستہ تھے۔ وہی ہر وقت سوچنے والا دماغ، وہی تنہائیوں میں بیٹھ کر نوع انسانی کے درد و دکھ پر آنسو بہانے والی فطرت، وہی جذبۂ محبت و رافت جو تمام بڑے بڑے مصلحین میں پایا جاتا ہے آپ میں بھی موجود تھا۔

اول اول آپ نے اپنے والد کے اصرار سے نواب دولت خاں لودی کی ملازمت کر لی تھی (جو اسوقت صوبہ پنجاب کا گورنر تھا) لیکن چونکہ طبیعت اس سے منحرف تھی اس لئے فرصت کے اوقات زیادہ تر جنگل کی تنہائیوں میں بسر کرتے اور سکھ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہیں آپ کو منصب نبوت عطا ہو کر وحدانیت کی تبلیغ کا ارشاد ہوا۔

بہرحال اگر اس روایت کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی یہ یقینی ہے کہ آپ نے تیس سال کی عمر میں نواب کی ملازمت ترک کر دی اور وحدانیت کی تبلیغ کے لئے آپ نے ہندوستان کے ان تمام مقامات کا دورہ شروع کر دیا جو ہندو مسلمانوں کے نزدیک مقدس سمجھے جاتے تھے۔

آپ نے ہر جگہ پہونچکر برہمنوں اور مولویوں کی مذہبی تنگ نظری اور پابندی رسوم کے خلاف احتجاج کیا اور کہا کہ اصل چیز صرف اخلاق کی درستی اور صداقت پرستی ہے جسے اختیار کرنے کے بعد نوع انسانی کے تمام افراد ایک ہی رشتے سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ آپ ایران ہوتے ہوئے بغداد اور مکہ معظمہ بھی گئے تھے اور بوشہر و کابل وغیرہ میں کچھ آدمی آپ کے مرید بھی ہوئے، لیکن مجھے اس کے ماننے میں تامل ہے کیونکہ آپ عربی و فارسی سے نابلد تھے اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہاں آپ کیا تبلیغ کر سکتے تھے۔ صاحب سیر المتاخرین نے لکھا ہے کہ سید حسن نامی کسی شخص سے آپ نے فارسی اور فقہ اسلام کی تعلیم حاصل کی تھی لیکن خود کٹر مذہب کے مورخ و نقاد اس سے انکار کرتے ہیں۔ بہرحال آپ مکہ معظمہ اور بغداد گئے ہوں یا نہ گئے ہوں، وہاں آپ کو کامیابی حاصل ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، یہ یقینی ہے کہ آپ نے سیاحت بہت کی اور بعض جگہ آپ کو اپنی تبلیغ میں کامیابی بھی ہوئی۔

عمر کے آخری دس سال آپ نے ایک گاؤں کرتارپور میں بسر کئے جو دریائے راوی کے کنارے آپ ہی کے لئے آپ کے کسی دولت مند مرید نے بسا دیا تھا۔ یہاں بکثرت آپ سے لوگ ملنے کے لئے آتے تھے اور اس جدید مسلک میں داخل ہوتے تھے۔ آپ نے ستر سال کی عمر پائی اور ۱۵۳۹ء میں انتقال کیا۔

آپ نے اپنے مرنے سے قبل ایک شخص انگد نامی کو جو آپ ہی کی طرح کھتری قوم کا تھا اپنا جانشین مقرر کیا اور تیرہ سال تک انھوں نے گرو نانک جی کے مشن کی تبلیغ کی۔ انھوں نے اپنے بعد ایک شخص امر داس کو نامزد کیا اور انھوں نے ۲۲ سال (۱۵۵۲ء سے ۱۵۷۴ء تک) اس منصب پر کام کیا۔ ان کے عہد میں سکھ مسلک کو بہت ترقی ہوئی کیونکہ ان کی تبلیغ زیادہ منظم طریقہ پر تھی اور مختلف مقامات پر شاخیں قایم کرکے اس کو بہت وسیع بنا دیا تھا۔ انھوں نے ایک "لنگر خانہ" بھی قایم کیا جہاں سب لوگ بغیر کسی تفریق نسب و حسب کے ایک ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ ان کی شہرت اتنی بڑھ گئی تھی کہ شہنشاہ اکبر خود ان سے ملنے گیا اور ایک بڑی جایداد ان کے مسلک کی تبلیغ کے لئے وقف کر دی۔

امر داس کے بعد ان کے داماد رام داس جانشین ہوئے اور انھوں نے زیادہ قوت کے ساتھ تبلیغ کو کامیاب بنایا۔ شہنشاہ اکبر ان پر بہت مہربان تھا چنانچہ ۱۵۷۴ء میں اس نے گرو رام داس کو ایک بڑا قطعہ زمین دیا۔ یہاں گرو رام داس نے ایک تالاب کھدوانا شروع کیا (جس کا نام بعد کو امرتسر ہوا) اور اس تالاب کے چاروں طرف اپنے مرید آباد کئے۔ گرو رام داس کے بعد ان کے بیٹے ارجن (۱۵۸۱ء میں) خلیفہ قرار پائے اور ان سے سکھ خلافت نے نسلی حیثیت اختیار کی۔ گرو ارجن کے عہد کا سب سے بڑا کارنامہ گرنتھ کی تیاری ہے۔ گرنتھ گویا سکھوں کی انجیل ہے جس میں اس مسلک کے رہنماؤں کے اقوال و نصایح یکجا کر دئے گئے ہیں۔ گرو ارجن کا مرتب کیا ہوا گرنتھ آدی گرنتھ (قدیم گرنتھ) کہلاتا ہے۔ اس کے بعد دسویں گرو نے جو گرنتھ مرتب کیا ہے اسے دسم گرنتھ کہتے ہیں۔

گرو ارجن روحانی رہنمائی کے ساتھ ساتھ دنیاوی امور کی تنظیم کا بھی خاص سلیقہ رکھتے تھے، چنانچہ انھوں نے اپنے نمائندے مقرر کرکے مریدوں سے باقاعدہ نذرانے وصول کرنے شروع کئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دولت کے لحاظ سے بھی بڑے آدمی ہو گئے۔ وہ اپنے آپ کو سچا بادشاہ کہا کرتے تھے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سیاسی قوت حاصل کرنے کے بھی خواہشمند تھے۔ انھوں نے تجارتی اقتدار حاصل کرنے کی بھی کوشش کی چنانچہ اپنے مریدوں کو علاوہ ہندوستان کے افغانستان اور وسط ایشیا تک بسلسلۂ تجارت روانہ کیا۔ جب ۱۶۰۶ء میں شاہزادہ خسرو نے اپنے باپ جہانگیر کے خلاف بغاوت کی تو گرو ارجن نے اس کی مدد کی اور اسی لئے جہانگیر نے آپ کو لاہور میں قید کر دیا۔

گرو ارجن کے بعد ان کے بیٹے ہرگوبند جانشین ہوئے۔ ان کے زمانہ میں سکھوں نے بہت ترقی کی۔ ان سے قبل جو چار گرو ہو چکے تھے ان میں زیادہ تر مذہبی کیفیت پائی جاتی تھی اور قوم کی دنیاوی ترقی کی طرف ان کو زیادہ خیال نہ تھا، لیکن گرو ہرگوبند نے دنیاوی عروج کے لئے جارحانہ کارروائیاں بھی شروع کیں اور

یہیں سے سکھوں کی عسکری قوت کا آغاز ہوتا ہے۔ گرو ہرگوبند چونکہ سپاہی منش آدمی تھے اور مردانہ ورزشوں سے بڑے شائق تھے اس لئے قدرتاً ان میں یہ جذبہ موجود ہونا چاہئے تھا کہ وہ اپنے مریدوں میں بھی یہی روح پیدا کریں۔ جہانگیر کی طرف سے سخت عناد تھا کیونکہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کے باپ گرو ارجن سنگھ کی وفات کا باعث وہی ہوا ہے۔ اس لئے انھوں نے اپنی جماعت کو مسلح کرنا شروع کیا اور دریائے بیاس کے کنارے ایک قلعہ ہرگوبند پور کے نام سے بنا کر باقاعدہ فوجی تنظیم میں مصروف ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند دن میں ان کے پاس ۸۰۰ گھوڑے اور ۳۰۰ مسلح سوار فراہم ہو گئے جو ہر وقت ان کی حفاظت کیا کرتے تھے۔

جب جہانگیر کو یہ خبر پہونچی تو اس نے ان کو طلب کیا اور قلعہ گوالیار میں مقید کر دیا لیکن چند دن بعد رہا کر دیا۔ جب تک جہانگیر زندہ رہا انھوں نے زیادہ سر نہیں اٹھایا لیکن جب شاہجہاں کا زمانہ آیا تو حکومت سے مخالفانہ اقدام شروع کر دی اور کئی بار صوبہ دار لاہور کی فوجوں کو شکست بھی دی لیکن پھر شاہجہاں کے انتقام سے [illegible] جا کر چھپ رہے اور وہیں اپنی زندگی ختم کر دی (۱۶۴۵ء)

گرو ہرگوبند سے قبل سکھوں کی جماعت ایک امن پسند و صلح کل جماعت تھی لیکن ان کے زمانہ سے انہیں حکومت و دولت حاصل کرنے کا شوق بھی پیدا ہوا اور اس طرح ان کے گرد کی حیثیت صرف روحانی رہنما کی ہی نہیں رہی، بلکہ فوجی سردار ہونے کا منصب بھی اس نے اختیار کر لیا۔

گرو ہرگوبند کے بعد ان کے بیٹے ہر رائے جانشین قرار پائے جو عزلت پسند انسان تھے۔ دارا شکوہ سے ان کے بہت دوستانہ تعلقات تھے، جب اورنگ زیب کی فوجوں نے دارا شکوہ کا تعاقب کیا تو ہر رائے نے دریائے بیاس عبور کرنے میں اس کی بہت مدد کی۔ اورنگ زیب کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اس نے گرو ہر رائے کو طلب کیا، لیکن انھوں نے اپنی جگہ اپنے بیٹے رام رائے کو بھیجدیا۔ اورنگ زیب نے رام رائے کو اس قسم میں کہ ہر رائے حکومت کے خلاف کوئی کارروائی نہ کریں گے نظر بند کر لیا۔

جب ۱۶۶۱ء میں گرو ہر رائے کا انتقال ہوا تو ان کا چھوٹا بیٹا (ہر کشن) جس کی عمر صرف ۶ سال کی تھی جانشین قرار پایا لیکن ادھر رام رائے نے اس جانشینی کی مخالفت کی اور اورنگ زیب سے فیصلہ چاہا۔ اورنگ زیب نے ہر کشن کو طلب کیا اور وہ دہلی آیا بھی لیکن یہاں پہونچکر چیچک کے عارضہ میں مبتلا ہوا اور مر گیا۔ یہ واقعہ ۱۶۶۴ء کا ہے۔

اس کے بعد جانشینی کے متعدد دعویدار پیدا ہو گئے لیکن کامیابی آخر کار تیغ بہادر (ہرگوبند کے بیٹے) کو حاصل ہوئی۔ انھوں نے ان تمام جھگڑوں سے بیزار ہو کر سوالک کی پہاڑیوں میں عزلت اختیار کر لی اور ایک مقام انند پور آباد کر کے وہیں رہنے لگے۔

انھوں نے ہندوستان کا بڑا وسیع دورہ کیا۔ دکن اور مشرقی بنگال میں بھی اپنی عبادتگاہیں تعمیر کیں اور پٹنہ میں بھی اپنا ایک تخت قائم کیا۔

کچھ دن بعد یہ پنجاب واپس آئے اور اس صوبہ کو اپنا مرکز قرار دیکر حکومت کے خلاف کارروائیاں شروع کردیں۔ یہاں تک کہ اورنگ زیب کو آخرکار اپنی فوج بھیجنا پڑی اور انھیں گرفتار کرکے قتل کرانا پڑا (۱۶۷۵ء)

گرو تیغ بہادر کے قتل کے بعد ان کے بیٹے گوبند رائے (جو ۱۶۶۶ء میں پیدا ہوئے تھے اور جن کی عمر اسوقت صرف ۹ سال کی تھی) جانشین قرار پائے۔ سکھوں کی تاریخ میں گوبند رائے کو بڑی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ سکھ جماعت نے انھیں کے زمانہ میں خالص عسکری حیثیت اختیار کی۔

گرو تیغ بہادر کے واقعۂ قتل نے نہ صرف سکھ جماعت بلکہ گوبند رائے کے اندر بھی جذبۂ انتقام مشتعل کردیا تھا لیکن چونکہ وہ بہت کمسن تھے اور شاہی افواج کا مقابلہ آسان نہ تھا اس لئے وہ پہاڑیوں میں چھپ کر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوئے۔ یہاں کامل ۲۰ سال تک وہ اطمینان و سکون کے ساتھ فنون حرب کی مشق اور ہندو مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ اسی کے ساتھ وہ مغل حکومت کے استیصال کی تدبیریں بھی سوچتے رہے۔ انھوں نے سب سے پہلے اپنی جماعت کے افراد میں اتحاد و جذبۂ مساوات پیدا کرنے کی کوشش کی اور ذات پات کی قید دور کرنے میں انتہائی سعی سے کام لیا۔

اس غرض کی تکمیل کے لئے جہاں اور تدابیر کیں وہیں ایک بڑی زبردست تدبیر بپتسمہ دینے کی بھی تھی۔ جسے ان کی زبان میں پہل کہتے ہیں۔ یعنی جو شخص سکھ مسلک میں داخل ہوتا تھا اس کو نہلا دھلا کر جماعت کے سامنے لاتے تھے۔ یہاں ایک آہنی ظرف میں شکر ڈالی جاتی تھی اور پانچ سربرآوردہ سکھ پانی ڈالکر خنجروں سے اُسے گھولتے تھے۔ جب یہ شربت (جسے امرت کہتے تھے) طیار ہوجاتا تھا تو اس شخص کے سر بلکہ تمام جسم پر چھڑکا جاتا تھا اور تھوڑا سا پلایا بھی جاتا تھا۔ اس رسم کے ادا ہونے کے بعد وہ شخص سنگھ کہلانے کا مستحق ہوجاتا تھا اور کچھ۔ کرپان۔ کیش۔ کنگھا اور کڑے کی پانچ پابندیاں اس پر عاید ہوجاتی تھیں۔ خالصہ کا لقب بھی اسی زمانہ سے اختیار کیا گیا۔ الغرض گرو گوبند رائے نے اجتماعیت کی بڑی زبردست رُوح سکھوں کے اندر پھونک دی۔ اور یہی وہ چیز تھی جس کی بدولت وہ بعد کو کامل ایک صدی تک پنجاب میں حکمراں رہے۔

چونکہ گرو گوبند سنگھ پہاڑیوں میں رہتے تھے اس لئے انھوں نے یہ کوشش بھی کی کہ پہاڑی علاقوں کے راجاؤں کو بھی مغل حکومت کی مخالفت پر آمادہ کریں، لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی، کیونکہ یہ کوہستانی راجا اگرچہ خدا جانے کس زمانہ سے خود مختارانہ حکومتیں کرتے چلے آرہے تھے اور وہ سکھوں کی تبلیغ مساوات کو پسند نہ کرتے تھے جب گرو گوبند سنگھ نے دیکھا کہ یوں صلح و آشتی سے کام نہ چلے گا تو عسکری قوت سے کام لینا شروع کیا اور

چاروں طرف کے رجواڑوں میں لوٹ مار شروع کردی۔ آخرکار بلاسپور، کانوچ، جسوڑھا اور نالاگڑھ کے راجاؤں نے متحد ہوکر دس ہزار کی جمعیت سے گرو گوبند سنگھ پر حملہ کردیا۔ گوبند سنگھ بھی اپنے دو ہزار سکھ مریدوں اور ۵۰۰ پٹھانوں کے ساتھ جوان کے ملازم تھے مقابلہ کے لئے آمادہ ہوگئے۔ حسن اتفاق سے سید بدھو شاہ جو ساڈھورہ کے حکمراں تھے گوبند سنگھ کے ساتھ ہولئے اور اس طرح بھنگانی کے مقام پر انھیں زبردست فتح حاصل ہوئی۔

اس کامیابی کا نتیجہ یہ ہوا کہ گوبند سنگھ کے حوصلے اور بڑھ گئے اور پہاڑی رجواڑوں کا امن وسکون بالکل جاتا رہا۔ آخرکار ان راجاؤں نے اورنگ زیب کی مدد طلب کی اور اس نے صوبہ دار سرہند کو حکم دیا کہ ان راجاؤں کے ساتھ ملکر گوبند سنگھ کے خلاف فوجکشی کیجائے۔

اس معرکہ میں گوبند سنگھ کو شکست ہوئی اور قلعہ انندپور میں پناہ لینی پڑی۔ مغل فوج نے قلعہ کا محاصرہ کرلیا اور یہ محاصرہ اتنے عرصہ تک قایم رہا کہ قلعہ کے اندر کا سامان خورد ونوش ختم ہوگیا اور تمام ساتھی ایک ایک کرکے علٰحدہ ہوگئے۔ گوبند سنگھ کی ماں، بیویاں اور بچے بھاگ کر سرہند گئے لیکن یہاں بھید کھل گیا اور دو بچے قتل کردئے گئے۔ خود گوبند سنگھ معہ اپنے چند ساتھیوں کے بہ تبدیل لباس قلعہ چمکور بھاگ کر پہونچے لیکن یہاں بھی وہ چین سے بیٹھنے نہ دئے گئے آخرکار عرصہ تک ادھر اُدھر سرگشتہ و پریشان پھرنے کے بعد مالوہ پہونچے اور یہاں پھر ان کے متبعین جمع ہونے لگے۔ اسی دوران میں کچھ عرصہ تک (ہانسی اور فیروزپور کے درمیان) دمدمہ میں قیام کیا اور دسم گرنتھ کی ترتیب شروع کی۔ یہ گرنتھ، آدی گرنتھ کا ضمیمہ سمجھا جاتا ہے۔ اتفاق سے اس زمانہ میں اورنگ زیب کا انتقال ہوگیا اور بہادر شاہ بادشاہ ہوئے، جنھوں نے گرو گوبند سنگھ سے جنگ کرنیکے بجائے صلح کرلینا مناسب سمجھا اور افواج دکن کی کمان ان کے سپرد کرکے اُدھر روانہ کردیا۔ یہاں پہونچنے کے تھوڑے دن بعد ہی ان کے ایک افغان ملازم نے بمقام ناندیڑ انھیں قتل کرڈالا (۱۷۰۸ء)

انھوں نے مرتے وقت اپنا جانشین مقرر کرنے سے انکار کردیا اور کہا کہ اب اپنا گرو، گرنتھ ہی کو سمجھو اس طرح گویا روحانی جانشینی کا مسئلہ سکھوں میں ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا اور گرو سازی بند ہوگئی۔

جب گوبند سنگھ دکن آئے تھے تو یہاں کشمیر کا ایک راجپوت بیراگی ان سے ملا تھا اور سکھ مسلک اختیار کرچکا تھا۔ اس نے اپنا نام بندہ (یعنی گرو گوبند سنگھ کا غلام) رکھا۔ جب گوبند سنگھ کا انتقال ہونے لگا تو انھوں نے بندہ کو بلاکر کہا کہ تم پنجاب جاؤ اور سکھوں کو جمع کرکے مسلمانوں سے میرے بچوں کے قتل کا انتقام لو۔

چنانچہ یہ پنجاب پہونچا اس نے لوٹ مار شروع کردی۔ چونکہ یہ اپنے ساتھیوں کا حصہ تقسیم کرنے میں بہت فیاضی سے کام لیتا تھا اس لئے چند دن میں ملک کے تمام لٹیرے اسی کے ساتھ ہوگئے اور اس کی قوت بہت بڑھ گئی۔ پھر چونکہ اس طرف اورنگ زیب کے انتقال کے بعد مغل حکومت گرتی جارہی تھی اور تخت کے لئے

شاہزادوں کی باہمی جنگ سے شیرازہ منتشر کر رکھا تھا اس لئے بندہ کو اور زیادہ آزادی ملگئی اور اس نے نہایت بیدردی سے غارتگری شروع کردی۔ ۱۷۱۰ء میں اس نے سرہند پہونچکر جس بیدردی سے قتل عام کیا ہے وہ سکھ مذہب کی تاریخ کا نہایت بدنما داغ خیال کیا جاتا ہے۔

بہادر شاہ اس وقت دکن میں تھا۔ لیکن اسے جب یہ خبریں پہونچیں تو وہ فوراً پنجاب واپس آیا اور بندہ کو شکست دی لیکن یہ پھر پہاڑی علاقہ میں بھاگ گیا۔ اس کے دو سال بعد بہادر شاہ کا انتقال ہوگیا اور تخت حکومت کے لئے اس کے بیٹوں میں لڑائی شروع ہوگئی اور جہاندار شاہ کو کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن وہ صرف گیارہ ماہ حکومت کرنے پایا تھا کہ فرخ سیر اس کو قتل کرکے خود تخت پر بیٹھ گیا۔ ان خانہ جنگیوں سے سکھ جماعت کو بڑا فایدہ پہونچا اور بندہ نے پھر لوٹ مار شروع کردی۔

فرخ سیر نے عبدالصمد خاں صوبہ دار پنجاب کو ہدایت کی کہ سکھوں کے مظالم کا انسداد کیا جائے چنانچہ اُسنے ایک بڑی فوج لیکر بندہ کا تعاقب کیا اور قلعۂ گورداسپور میں اس کو محصور کرلیا۔ آخرکار گرفتار کرکے دہلی بھیجدیا گیا اور یہاں ۱۷۱۶ء میں قتل کردیا گیا۔

بندہ کا زمانہ سکھ مذہب کے نقطۂ نظر سے بھی قابل تعریف نہیں سمجھا جاتا کیونکہ علاوہ خودغرضی اور نفس پروری کے اس نے خود اپنے آپ کو گرو کی حیثیت دیکر ایک مسلک اور پیدا کرنا چاہا جو گرو گوبند سنگھ کی ہدایت کے خلاف تھا۔ اس نے بعض عقاید و مراسم میں کچھ تبدیلیاں بھی پیدا کرنا چاہیں جس سے سکھوں میں اور زیادہ بددلی پیدا ہوگئی۔

بندہ کے قتل کے بعد سکھوں پر بہت خراب زمانہ آیا کیونکہ حکومت نے اس جماعت کو قزاق و باغی قرار دیکر استیصال کامل کا تہیہ کرلیا تھا۔ بہت سے سکھ تو اس مسلک سے تائب ہوکر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور جو چند وفادار ثابت ہوئے وہ پہاڑیوں میں جاکر پناہ گزیں ہوگئے۔ الغرض فرخ سیر کے زمانہ میں سکھوں کے خلاف پے در پے ایسی سخت تدابیر اختیار کی گئیں کہ یہ جماعت تقریباً ختم ہی ہوگئی تھی، لیکن چونکہ مغل حکومت روز بروز کمزور ہوتی جارہی تھی اور احمد شاہ ابدالی کے مسلسل حملوں نے پنجاب میں مغلیہ حکومت کے اثر کو تقریباً زایل کردیا تھا اس لئے سکھوں کو اپنی قوت فراہم کرنے کا پھر موقعہ مل گیا اور لوٹ مار شروع کردی۔ اسوقت ان کے تمام اقدامات کا مرکز امرتسر تھا جہاں انھوں نے بہت استحکام سے اپنے پاؤں جمالئے تھے۔

۱۷۵۶ء میں شاہزادہ تیمور نے جو اپنے باپ احمد شاہ ابدالی کی طرف سے پنجاب کا گورنر تھا پھر سکھوں پر فوجکشی کی اور انھیں شکست دیکر ہرمندر کو توڑ ڈالا اور ان کے مقدس تالاب کو پاٹ دیا۔ لیکن سکھوں نے پھر اپنے منتشر شیرازہ کو یکجا کرکے تیمور کو پنجاب سے نکال باہر کیا اور لاہور پر قبضہ کرلیا۔ اسوقت ان کا سردار

جسا سنگھ کلال تھا جس نے اپنے نام کا سکہ بھی جاری کیا، لیکن اسی زمانہ میں (۱۷۵۸ء) مرہٹوں نے رگھوبا کی سیادت میں خروج کیا اور سکھوں کو لاہور سے نکال دیا۔

احمد شاہ کو جب یہ خبر پہونچی تو پانچویں مرتبہ اس نے پھر پنجاب پر حملہ کیا اور پانی پت کی مشہور لڑائی میں مرہٹوں کو مار بھگایا (۱۷۶۱ء)۔ لیکن احمد شاہ کا واپس جانا تھا کہ پھر سکھوں نے سر اٹھایا اور گھوئی ہوئی طاقت پھر حاصل کرلی۔ اس کے بعد احمد شاہ پھر پنجاب آیا اور ۱۷۶۲ء میں لودھیانہ کے قریب سکھوں کو ایسی فاش شکست دی کہ اگر احمد شاہ کو قندھار کی بغاوت فرو کرنے کے لئے پنجاب نہ چھوڑنا پڑتا تو سکھوں کا وجود ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا تھا، مگر اس طرف احمد شاہ کا قندھار جانا تھا کہ ۱۷۶۳ء میں انھوں نے پھر سرہند پر حملہ کردیا اور وہاں کے گورنر زین خاں کو شکست دیکر لاہور پر بھی قبضہ کرلیا۔ اس مرتبہ چونکہ ان کے پاؤں زیادہ قوت و استحکام کے ساتھ جم گئے تھے اس لئے امرتسر میں جمع ہوکر انھوں نے پنجاب میں خالصہ حکومت کا اعلان بھی کردیا اور انتظام ایک قومی کونسل کے سپرد کردیا گیا۔ اس زمانہ میں جو سکہ خالصہ حکومت نے جاری کیا اسپر فارسی کا یہ شعر درج تھا:۔

دیگ و تیغ و فتح و نصرت بے درنگ
یافت از نانک گرو گوبند سنگھ

سکھوں کے لئے یہ زمانہ بڑے اطمینان کا تھا اور کوئی خطرہ ان کے لئے باقی نہ رہا تھا اس لئے چاہئے تھا کہ انکی اجتماعی حیثیت اور زیادہ قوی ہوجاتی، لیکن دولت و حکومت ایسی بلائے بد ہے کہ اس کے سامنے تمام ملکی و قومی مفاد نظر انداز کردئے جاتے ہیں، چنانچہ سکھوں کے سرداروں میں بھی اختلاف پیدا ہوگیا اور خالصہ حکومت بارہ جگہ تقسیم ہوگئی۔

چونکہ یہ تمام سکھ ریاستیں اپنی اپنی جگہ خود مختار تھیں اس لئے ان میں باہم لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں اور جب کامل تیس سال اس حال میں گزر گئے تو قدرت نے ان میں ایک ایسا شخص پیدا کیا جس نے ان تمام متفرق ریاستوں کو ملاکر ایک کردیا۔ اس کا نام رنجیت سنگھ تھا۔

رنجیت سنگھ، مہا سنگھ کا بیٹا تھا جس کی حکومت کا مرکز گوجرانوالہ تھا۔ رنجیت سنگھ کی عمر بارہ سال کی تھی جب یہ اپنے باپ کی جگہ تخت نشین ہوا۔ (۱۷۹۲ء)

۱۷۹۹ء میں زماں شاہ (احمد شاہ ابدالی کے پوتے) نے لاہور اس کو تفویض کیا اور ۱۸۰۲ء میں امرتسر خود اس نے فتح کیا۔ چونکہ پنجاب میں یہ دو مقام مرکزی حیثیت رکھتے تھے اس لئے ان پر قابض ہونے کے بعد رنجیت سنگھ کا اقتدار بہت بڑھ گیا اور اس نے مہاراجہ کا لقب اختیار کرکے سکھوں کی تمام متفرق ریاستوں

پر قبضہ کر لیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزوں کی حکومت ستلج تک وسیع ہو گئی تھی اور رنجیت سنگھ اس سے دوستانہ تعلقات رکھتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۰۹ء میں دونوں کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا جس کی پابندی رنجیت سنگھ نے سختی سے کی۔

رنجیت سنگھ نے اپنی فوجی قوت بڑھانے میں ان فرانسیسی جنرلوں کی خدمات بھی حاصل کیں جنھوں نے نپولین کے ساتھ کام کیا تھا اور جو واٹرلو کی لڑائی کے بعد پنجاب چلے آئے تھے۔ اور اس طرح ایک زبردست باقاعدہ فوج مرتب کر کے اس نے نہ صرف تمام پنجاب بلکہ کشمیر اور پشاور پر بھی قبضہ کر لیا۔ چنانچہ جس وقت ۱۸۳۹ء میں اس کا انتقال ہوا تو اس کی حکومت ستلج سے لیکر ہندوکش تک پھیلی ہوئی تھی اور کسی میں سر اٹھانے کی جرأت نہ تھی۔

اس کے مرنے کے بعد اس کے تین بیٹے یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے لیکن ان میں سے کوئی اس کا اہل نہ تھا کہ اس کی بنائی ہوئی سلطنت کو علی حالہٖ قائم رکھتا، چنانچہ خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں اور بدامنی اس حد تک پھیل گئی کہ فوجیں قابو سے باہر ہو گئیں اور انگریزی علاقہ میں انھوں نے تاخت شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں نے ان سے جنگ کر کے پے در پے شکستیں دیں اور لاہور میں ان کا ایک رزیڈنٹ رہنے لگا، جو نابالغ راجہ دلیپ سنگھ کی کونسل میں پریسیڈنٹ کی حیثیت رکھتا تھا۔

اس کے تقریباً ایک سال بعد ملتان کے گورنر دیوان مولراج نے بغاوت کی اور اس موقعہ کو غنیمت جانکر سکھوں نے پھر انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۴۹ء میں سکھوں کی حکومت پنجاب سے ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی اور یہ صوبہ بھی انگریزی حکومت میں شامل کر لیا گیا۔

یہاں تک تو مختصراً سکھوں کی تاریخ عروج و زوال تھی اب مجملاً ان کے مذہب کا حال بھی سن لیجئے۔ جیسا کہ ابتدائی سطور میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اس مذہب کی بنیاد کا سبب صرف یہ تھا کہ ہندو برہمنوں کا روحانی استبداد بہت بڑھ گیا تھا اور ذات پات کے جھگڑوں نے لوگوں میں بہت بد دلی پیدا کر دی تھی، چنانچہ گرو نانک نے ہندو مذہب کی واہمہ پرستی اور ناواجب قیود کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور خالص وحدانیت کی تعلیم پیش کر کے بتایا کہ اصل چیز پاکیزگی اخلاق ہے۔ انھوں نے بت پرستی کی بھی سخت مخالفت کی۔ البتہ تاریخ کے قائل ضرور تھے گرو کا مرتبہ ان کے یہاں وہی ہے جو مسلمانوں میں خلفاء یا ائمہ کا کہ بغیر ان کی وساطت کے خدا تک رسائی مشکل ہے۔

گرو نانک نے جو شریعت پیش کی وہ کوئی رسمی چیز نہ تھی بلکہ اس کا مقصود معاشرت و اخلاق کی اصلاح تھا، چنانچہ گوبند سنگھ کے زمانہ تک سکھ مذہب میں انتہائی سادگی پائی جاتی تھی لیکن گوبند سنگھ کے زمانہ میں کچھ قیود اور

اضافہ کیے گئے اور تمباکو و شراب کا استعمال ناجایز قرار دیا گیا۔ سکھوں کی مقدس کتاب کا نام گرنتھ ہے، اس کے دو حصے ہیں، پہلا حصہ آدی گرنتھ کہلاتا ہے جسے گروارجن سنگھ نے مرتب کیا تھا۔ اس میں پہلے پانچ گروؤں کے ارشادات درج ہیں اور ان کے علاوہ دوسرے مقدس لوگوں کے اقوال بھی شامل ہیں مثلاً کبیر۔ نامدیو۔ جے دیو رامانند اور شیخ فرید۔ اس گرنتھ کا بڑا حصہ نظموں پر مشتمل ہے جو ہندی زبان اور گورمکھی رسم الخط میں تحریر کی گئی ہیں۔ کچھ باقی حصہ اور مختلف زبانوں میں ہے، حتےٰ کہ فارسی زبان کے بھی بعض روایات و اشعار اسمیں پائے جاتے ہیں ـــ دسم گرنتھ، دسویں گرو (گوبند سنگھ) کا مرتب کیا ہوا ہے۔ اس کا ایک حصہ خدا کی حمد کے لئے وقف ہے اور دوسرے میں گرو گوبند سنگھ کے خود نوشتہ حالات پائے جاتے ہیں بعض ہندی شعراء کے عارفانہ دوہے بھی اسمیں شامل ہیں ـــ ہرچند گرونانک کی تعلیم میں اتنی ہمہ گیری پائی جاتی تھی کہ ہندو مسلمان دونوں کے لئے اس میں کافی کشش تھی اور ان دونوں مذاہب کے لوگ سکھ مسلک میں داخل بھی ہوئے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انکا خطاب زیادہ تر ہندوؤں ہی سے تھا، کیونکہ نہ صرف بہ لحاظ مذہب بلکہ بہ لحاظ تہذیب و معاشرت بھی وہ ہندو ہی تھے۔ وہ ہندو مذہب میں صرف اصلاح چاہتے تھے نہ کہ اس کا مٹا دینا اس لئے سکھ جماعت میں زیادہ تر ہندو ہی داخل ہوئے اور ان کو ہونا چاہئے تھا۔ جس طرح دیگر مذاہب میں بہت سے فرقے پائے جاتے ہیں اسی طرح سکھ مذہب میں بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی ایک خاص جماعت کو کیش دھاری کہتے ہیں اور دوسری کو سہج دھاری اول الذکر میں وہ لوگ شامل ہیں جو گرو گوبند سنگھ کے متبعین کہلاتے ہیں اور جنھوں نے بپتسمہ قبول کیا۔ موخر الذکر جماعت ان سکھوں کی ہے جنھوں نے بپتسمہ نہیں لیا اور فوجی خدمات اختیار کیں، ـــ ایک اور گروہ نانک پنتھی کہلاتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو ابتدائی پانچ گروؤں کے متبع ہیں اور گرو گوبند سنگھ کے قایم کئے ہوئے رسوم و قیود کے پابند نہیں ہیں۔ نہ یہ لمبے بال رکھتے ہیں نہ تمباکو پینے کو منع کرتے ہیں اور نہ بپتسمہ لیتے ہیں۔

ایک جماعت اُداسی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ لوگ گرونانک کے بیٹے سری چند کے ماننے والے ہیں اور مجرد زندگی بسر کرکے عارفانہ درجات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک اور خاص جماعت وہ ہے جو اکالی کہلاتی ہے (یعنی اکال۔ غیر فانی خدا۔ کی پرستار) یہ لوگ گرو گوبند سنگھ کے متبع ہیں اور ان کی قایم کی ہوئی عسکری تنظیم سے وابستہ ہیں ـــ ایک گروہ بندئی کہلاتا ہے جو بندہ کو گیارھواں گرو تسلیم کرتا ہے ـــ رام داسی جماعت بھی سکھوں کی ہے لیکن صرف اُن چاروں کی جنھوں نے یہ مسلک قبول کیا۔

سکھوں کے معبد ہندوستان میں مختلف جگہ پائے جاتے ہیں لیکن امرتسر، گورداسپور، اور فیروزپور خاص مرکزی مقام سمجھے جاتے ہیں۔ علی الخصوص امرتسر جہاں ان کا مقدس تالاب موجود ہے اور ننکانا صاحب جہاں گرونانک پیدا ہوئے تھے۔

مرزا رسوا کی ایک گمشدہ مثنوی

مرزا محمد ہادی، آغا محمد تقی کے صاحبزادہ تھے اور ہنگامۂ مشرق کے وقت لکھنؤ میں پیدا ہوئے، اپنے والد ماجد سے علوم شرقیہ میں تکمیل حاصل کی اور انگریزی لامارٹینیر کالج میں پڑھی۔ رڑکی سے اوورسیری کا امتحان پاس کیا۔ ملازم ہوکر کابل چلے گئے، مگر طبیعت کو مناسبت نہ تھی ترک تعلق کرکے لکھنؤ چلے آئے۔ اُن کے چچا آغا محمد نقی شاہی فوج میں کمانڈر تھے۔ جب آغا محمد تقی[1] کا انتقال ہوگیا تو مرزا محمد ہادی اپنے چچا کے پاس رہنے لگے۔ دس گیارہ سال کے سن سے شعر کہتے تھے مرزا تخلص تھا اور مرزا محمد جعفر اوج سے مشورہ لیتے تھے۔ لکھنؤ واپس آکر کرسچین کالج میں ملازمت کرلی۔ اور ۱۸۹۴ء میں بی اے پاس کیا۔ واشنگٹن یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری امراؤ جان ادا پر عطا کی، آخر حصۂ عمر میں عثمانیہ یونیورسٹی کے دار الترجمہ سے تعلق ہوگیا تھا۔

مرزا رسوا نے بہت سے ناول اور ڈرامے لکھے لیکن جو شہرت شریف زادہ اور امراؤ جان ادا کو نصیب ہوئی وہ دوسری تصانیف کو میسر نہ ہوئی۔ آپ نے ریاضیات، فلکیات و فلسفہ کی کتابوں کے تراجم بھی شایع کئے لیکن وہ مقبول نہ ہوسکے۔ مرزا رسوا[2] کی گفتگو میں غضب کی دل آویزی تھی۔ یہ جس محفل میں ہوتے تھے لوگ ہمہ تن گوش ہوکر انھیں کی باتیں سنا کرتے تھے، کوئی شخص کتنا ہی غمگین کیوں نہ ہوتا ان کی صحبت میں اُس کا غم غلط ہوجاتا تھا۔ روتے آدمی کو ہنسا دینا اُنکے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ طبیعت بہت رسا اور موزوں پائی تھی۔ شعر و سخن کے ذوق کو حسن پرستی کے مذاق نے اور زیادہ اُجاگر کردیا تھا۔ مزاج میں کسی حد تک شورش تھی۔ اور اطباء کی رائے تھی کہ دماغ کا خلل ہے اور بعض ستم ظریفوں کی یہ رائے تھی کہ یہ سب جن و پری کے مسخر کرنے کا بہانہ تھا — بہرحال کچھ ہو دماغی توازن میں کچھ فرق ضرور تھا۔

امراؤ جان ادا سوانح عمری ہے۔ افسانہ میں تمثیل ہے۔ نصیحت کا دفتر ہے۔ شعر و شاعری کا تذکرہ ہے سب سے

---

[1] بعض واقف کار کہتے ہیں کہ آغا محمد صفدر نام ہے بعض آغا حیدر مہدی کہتے ہیں واللہ اعلم۔ ناظر

[2] مرزا رسوا کی یہ سیرۃ امراؤ جان ادا کی منت پذیر ہے۔ ناظر

بڑھ کر یہ کہ حسن و عشق کی لطیف داستانوں سے ہے۔ اس افسانہ کی اشاعت کے بعد مرزا نے ایک نسخہ امراؤ جان کی خدمت میں بھی تحفتاً بھیجا تو امراؤ جان نے مرزا کی ایک ناتمام مثنوی کا نسخہ جس کو اُنہوں نے مرتب کیا تھا جواباً مرزا کی خدمت میں بھیجا۔ ہمارا مقصود اس صحبت میں اُسی گم شدہ مثنوی کو پیش کر کے بحث و تمحیص کرنا ہے۔

مثنوی اب ناپید ہے اور مشکل ہی سے کسی کتب خانہ میں نظر آئے گی۔ میرے پیش نظر جو نسخہ ہے وہ امیر محل لائبریری کا ہے اس مثنوی پر جو تعارف امراؤ جان ادا نے لکھا تھا وہ نقل کیا جاتا ہے اُس سے پتہ چلے گا کہ کس انتقامی جذبہ سے یہ مثنوی شائع ہوئی ہے ورنہ مرزا رسوا شاید اس کو کبھی شائع نہ کرتے۔

"ناظرین، مرزا رسوا صاحب نے جو میری سرگزشت تحریر کی ہے آپ کی نظر سے گزری ہوگی خیر یہ میں اب نہیں کہتی کہ اچھا کیا یا بُرا مگر پہلے سے اس کا اقرار نہ تھا اس لئے کسی قدر ملال ہوا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری آوارگی کا افسانہ چھاپ کر شائع کیا جائے گا تو شاید میں ہرگز اس کے بیان کرنے پر راضی نہ ہوتی واقعی مرزا صاحب کا چکمہ چل گیا لطف یہ ہے کہ آپ فرماتے ہیں میں نے تجھ پر احسان کیا، اگر درحقیقت یہ احسان ہے تو میں بھی اُنکے ساتھ اس کا عیوض کرتی ہوں۔

دُشنام دیکے مجھ کو بہت خوش نہ ہو جئے
کیا کیجئے گا آپ جو میری زباں کھلی،

مرزا رسوا کے حالات کا دریافت کرنا آسان نہ تھا یہ وہ شخص ہیں جو اپنا نام تک لوگوں سے چھپاتے ہیں اب تو ماشاءاللہ سے گلدستوں میں غزلیں شائع ہونے لگی ہیں، رہتے ایسی جگہ ہیں جہاں کسی کی مشکل سے رسائی ہوسکتی ہے میں صرف ایک مرتبہ آپ کے دولت خانہ پر حاضر ہو کر اس کی زیارت سے مشرف ہو چکی ہوں مگر اُسوقت جب مجھے معلوم تھا کہ آپ گھر پر تشریف نہیں رکھتے تھے۔ بات یہ تھی کہ جب سے آپنے میری سوانحعمری کے شائع کرنے کا قصد کیا مجھے بھی کد ہوگئی کہ آپ کے بعض اسرار سے دنیا کو واقف کردوں۔ اس کے لئے مجھے خاص اہتمام کرنا پڑا۔ آپ کا ایک ملازم خاص جس کے نام و نشان سے میں مطلع نہیں کر سکتی مجھ سے موافق ہوگیا ایک دن آپ ایک دوست کے گھر پر مشاعرہ میں تشریف رکھتے تھے۔ بندی نے فوراً گاڑی کرایہ کی اور آپ کی کوٹھی پہونچی آپ کا آدمی جو مجھ سے مل گیا تھا۔ اُس نے چپہ چپہ مجھے دکھا دیا اُسی آدمی کے ذریعہ سے آپ کی ایک کتاب جس میں ایک تصویر اور بہت سے خطوط ایک ناتمام مثنوی نالہ رسوا میرے ہاتھ لگی کچھ حالات بعض دوستوں سے بھی معلوم ہوئے غرض کہ ان واقعات کو میں نے بطور خود لکھ کے چھپوا لیا ہے لطف یہ ہوا کہ جس دن مرزا صاحب نے میری سوانح عمری شائع کی اور ایک جلد میرے ملاحظہ کیلئے بھیجی اُس دن میں نے اس مختصر تحریر کی ایک جلد اُنکی خدمت میں روانہ کی۔ یقیناً مرزا صاحب خوش تو ہوئے ہوں گے مگر کیا کر سکتے ہیں۔

فدویہ
امراؤ جان ادا

یکم اپریل ۱۸۹۵ء

اس تعارف سے پتہ چلتا ہے کہ امراؤ جان ادا کی اشاعت بھی ۱۸۹۹ء کی ہے۔ اس مضمون میں جو حالات مرزا رسوا کے لکھے گئے ہیں وہ اسی مثنوی کے حاشیوں سے لئے گئے ہیں جو امراؤ جان نے لکھے تھے۔ بظاہر مرزا صاحب کے حالات لکھنے میں امراؤ جان نے مبالغہ اور تصنع کو دخل دیا ہے اور ان حاشیوں کی روشنی میں مرزا صاحب کے کردار کے خدوخال بہت نمایاں و ممتاز ہو گئے ہیں!

مرزا رسوا کے چچا آغا محمد نقی شاہی فوج میں ایک معزز عہدہ پر فائز تھے والد کے سایۂ عاطفت سے محروم ہونے کے بعد چچا نے اپنے مرحوم بھائی کی واحد نشانی کو اپنی سرپرستی میں لے لیا کچھ دنوں کے بعد چچا نے بھی رفاقت سے منھ موڑا اب چچی نے ہاتھ رکھا۔ لیکن چچی بھی کچھ زیادہ رفیق ثابت نہ ہوئیں چند سال کے اندر سارا گھر ختم ہو گیا، چچا، مرزا رسوا کی شادی اپنی لڑکی سے کرنا چاہتے تھے لیکن مرزا رسوا نے انکار کر دیا۔ غالباً اس کی وجہ اس مثنوی کی ہیروین تھیں جن کی محبت میں وارفتہ ہو کر مرزا رسوا نے اپنی بنت عم سے شادی کرنا مناسب نہ سمجھا۔

بظاہر بھائی بہنوں میں چچا چچی کی زندگی تک بہت میل رہا لیکن بہن کی شادی ہوتے ہی یہ میل محبت عداوت و دشمنی میں مبدل ہو گیا۔ اب مرزا رسوا کو بڑی مشکل یہ پیش آئی کہ مرزا رسوا محجوب ہونے کی بنا پر اپنے موروثی گھر سے بھی محروم کر دئے گئے تھے۔ اس آڑے وقت میں اُن کی ایک انا بوا پری چہرہ کام آئیں اور مرزا رسوا اُنکے مکان میں رہنے لگے۔ انا مارٹینر کالج میں نام لکھوا لیا اور انگریزی پڑھنا شروع کی۔ لیکن تائید غیبی سے اکثر سو روپئے کے نوٹ پرنسپل صاحب کے ذریعہ سے اُن کو ملتے رہے اور اُن کا تعلیمی زمانہ کسی طرح گزر گیا۔ اور اس تائید غیبی کا حال اُن کے اکثر احباب کو معلوم ہو گیا تھا لیکن ابھی تک کسی کو یہ علم نہ تھا کہ ان روپیوں کا بھیجنے والا کون ہے ممکن ہے پرنسپل صاحب اس کو جانتے ہوں مگر بتلانے کی اُن کو اجازت نہ ہو۔

شہنشاہ نصیر الدین حیدر کے عہد سے فرنگی سوداگر لکھنؤ میں آکر آباد ہونا شروع ہو گئے تھے۔ چنانچہ اسی قسم کا ایک خاندان عنایت باغ کے قریب رہا کرتا تھا۔ اس خاندان کا سردھرا فلپ بمبرٹ اگسٹائن نامی ایک سوداگر جواہرات تھا۔ اُن کے والد مسٹر اگسٹاین فرانسیسی تھے اور اُن کی رفیقہ حیات مسز اگسٹاین انگلستان کی باشندہ تھیں یہ لوگ اینگلو انڈین ہو چکے تھے کیونکہ عرصہ سے ہندوستان میں مقیم تھے اس لئے اُردو زبان میں شعر و شاعری کرتے تھے، حقہ پیتے تھے، ہندوستانی کھانے کھاتے تھے۔ غدر کے زمانہ میں آغا محمد نقی نے انکو اپنے مکان میں چھپا لیا تھا اس لئے وہ لوگ مرزا رسوا کے خاندان کا بڑا خیال کرتے تھے مرزا صاحب کی چچی اور مسز اگسٹائن میں بڑا رسم تھا گو مذاہب میں اختلاف تھا لیکن آپس کے تعلقات پر اس کا کوئی اثر نہ پڑتا تھا

اُن کی ایک "حور لقا" لڑکی مس صوفیہ اگسٹائن تھی جب مرزا صاحب نے ہوش سنبھالا تو مس صوفیہ کو بہ نظر خاص دیکھا دونوں نے ایک دوسرے کے جذبات کی والہانہ انداز میں پذیرائی کی اور یہی وہ پذیرائی تھی جس نے آخر میں نالۂ رسوا کی شکل اختیار کی۔ کچھ دنوں کے بعد مسٹر اور مسز اگسٹائن نے انتقال کیا تو اُن کا علاقہ کورٹ ہو گیا اور ادھر مس صوفیہ کا مرزا رسوا سے ملنا بہت کم ہو گیا۔

مس صوفیہ جس وسیع کوٹھی[1] میں رہا کرتی تھیں وہ چوک سے ۲ میل فاصلہ پر تھی اور اُس سڑک سے قریب تر تھی جو لوہے کے پل سے بارہ بنکی جاتی ہے۔ ضلع بارہ بنکی اُس زمانہ میں نواب گنج کہلاتا تھا۔ باغ وسیع و کشادہ تھا۔ چاروں طرف ایک مختصر فصیل بنی ہوئی تھی دور تک کہیں آبادی کا نشان نہ تھا۔ پہلے اس طرف آمد و رفت زیادہ تھی لیکن جب سے ریل نکلی لوگوں کی آمد و رفت کم ہوتی گئی۔ اس عالم ہو "دخشت آباد" میں مس صوفیہ اور بعد میں مرزا رسوا رہتے تھے۔ باغ کے وسط میں ایک چھوٹا سا بنگلہ بہت خوشنما تھا۔ بنگلہ کے سامنے دور پر ایک پختہ گول چبوترہ بنا ہوا تھا۔ اس کے گرد چمن بندی تھی۔ صبح و شام مس صوفیہ اُس پر رونق افروز ہوتی تھیں شمالی جانب ایک جالیدار چوبی احاطہ تھا اس میں سنگی پہاڑیاں بنی ہوئی تھیں اور عجیب و غریب قسم کے درخت اس پر لگے ہوئے تھے معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس پتھروں سے یہ درخت اُگے ہیں۔ وسط میں سنگ مرمر کا حوض پانی سے بھرا ہوا تھا جس کے چاروں طرف نالیاں بہتی تھیں اس احاطہ کے چاروں طرف اردگرد سرکیاں لگی رہتی تھیں یہ مقام موسم گرما میں بہت لطیف ہو جاتا تھا، سقے متواتر پانی چھڑکا کرتے تھے۔ مرزا صاحب بھی اکثر اپنی دوپہر یہیں گزارتے تھے، بنگلہ اندر سے سجا ہوا تھا۔ اس بنگلہ کے ایک کمرہ میں مس صوفیہ رہا کرتی تھیں — بعد میں مرزا صاحب اسی میں رہتے تھے اور سب بنگلہ مقفل رہا کرتا تھا۔

روزانہ سر شام تمام باغ میں چھڑکاؤ کیا جاتا تھا۔ درختوں کی ایک ایک پتی دھوئی جاتی تھی جا بجا فانوس کاشانی روشن ہوتے تھے صحن میں چبوترہ پر کرسیاں بچھائی جاتی تھیں درختوں کے گملے سلیقہ سے رکھے جاتے تھے۔ مس صوفیہ اگسٹائن کا علاقہ ۱۹۰۰ء کے بعد واگزار ہوا۔ وہ لکھنؤ آکر اپنی کوٹھی (بنگلہ) میں رہنے لگیں۔

---

[1] آجکل اس جگہ راجہ ادیل کی شاندار کوٹھی بنی ہوئی ہے عنایت باغ سے یہ لوگ دوسرے روڈ پر اُٹھ گئے تھے افسوس کہ یہ کوٹھی بھی کھدگئی اور نہ کہیں رہا نہ مکاں رہا۔ اکثر قرب و جوار کے لوگ مس صوفیہ کی داستانیں بیان کرتے ہیں لیکن وہ صوفیہ بی بی کے نام سے مشہور ہیں اور بالعموم لوگ اُن کو مسلمان سمجھ کر نذر و نیاز بھی کرتے رہتے ہیں۔ ناظر

مگر مرزا رسوا بے بُلائے جانا نہ چاہتے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد مس صوفیہ نے خط لکھ کر مرزا صاحب کو بلایا۔ مرزا صاحب عرصہ کے بعد اپنے محبوب کے دربار میں حاضر ہوئے شکوہ و شکایات کے دفتر کھلے ان کی پچھلی خطائیں معاف ہوئیں۔ مس صوفیہ نے ہزاروں آرزوؤں اور منتوں کے بعد مرزا صاحب کو اپنی جائداد کا مختار کل بنا دیا مرزا صاحب نے ناتجربہ کاری کی بنا پر انکار کیا لیکن ان کا انکار مس صوفیہ کے اصرار کے سامنے کمزور ثابت ہوا۔

اس دور میں مرزا صاحب اور مس صوفیہ میں انگوٹھیاں بدلی گئیں، نباہ کے وعدوں کی تجدید ہوئی۔ الغرض آتش شوق، دونوں طرف برابر لگی ہوئی تھی اور "جوانی" کی "آگ" یکساں مشتعل!

اس اثنا میں مس صوفیہ نے بمبئی جانے کا ارادہ کیا مرزا رسوا بھی ساتھ گئے گرینڈ ہوٹل میں دو کمرے کرایہ پر لئے۔

ایک دن سر شام مس صوفیہ نے یہ شکایت کی کہ مرزا میں تماشہ نہ جاؤں گی میری طبیعت خراب ہے کھانا کھا کر سو رہوں گی۔ مرزا صاحب بھی کہیں نہ گئے، اگلی صبح کو جانے کے وقت جب مس صوفیہ کمرہ سے برآمد نہ ہوئیں تو مرزا صاحب کو تشویش ہوئی لیکن آداب فرنگی کی بنا پر بغیر اجازت کمرہ میں چلا جانا مناسب نہ تھا جب انتظار کی حد ہو گئی تو مجبوراً سونے کے کمرہ میں داخل ہوئے۔ کمرہ خالی تھا ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ نوکروں سے دریافت کیا معلوم ہوا کہ مس صاحب نے ۱۱ بجے گاڑی مانگی تھی وہ گاڑی پر کہیں چلی گئی ہیں اور دونوں دن کا کرایہ ادا کر گئی ہیں سخت تشویش ہوئی وہ اسی شش و پنج میں تھے کہ میز پر صوفیہ کا ایک خط اپنے نام کا پایا اس میں لکھا تھا۔

میرے پیارے! تم میرے بے اطلاع دفعتاً غائب ہو جانے سے ملول نہ ہونا بات یہ ہے کہ میں بمبئی میں محض سیر و سیاحت کے لئے نہ آئی تھی، بات یہ ہے کہ لکھنؤ میں مجھ کو اطلاع ملی تھی کہ میری پھوپھی جو پیرس میں رہتی تھیں کروروں کی جایداد چھوڑ کر انتقال کر گئی ہیں، سوا میرے اُن کا کوئی جائز وارث نہ تھا۔ اُن کے مختار کے خط سے یہ معلوم ہوا کہ جایداد پر سرکاری طور سے قبضہ حاصل کرنے کے لئے میرا وہاں جانا ضروری تھا اس لئے میں پیرس جا رہی ہوں اور آراضی اور مکانات فروخت کر کے روپیہ نقد کروں گی اور لکھنؤ چلی آؤنگی میں تم کو اپنا شوہر اور لکھنؤ کو اپنا وطن سمجھتی ہوں۔ تم ان حالات میں سمجھ سکتے ہو کہ میرا جانا کس قدر ضروری تھا۔ میں اسی سے تم کو بمبئی نہ لائی تھی کہ تم کو ملال ہوگا، مگر تم نے ضد کی اب مجبوراً مجھ کو واقعہ تم سے بیان کرنا پڑا۔ تم کو ساتھ نہ لیجانے میں یہ مصلحت ہے کہ ولایت والے جن میں اکثر میرے دور کے رشتہ دار اور عزیز ہیں تم کو ہمراہ دیکھ کر بُرا مانتے اور شاید میرے معاملات میں مشکلات بھی پڑ جاتیں اور ممکن ہے کہ ناکامیابی ہوتی وہاں کے اکثر لوگ مجھے

اتنی بڑی جائداد کا وارث سمجھ کر امید موہوم سے خوشامد میں میرا کام کریں گے۔ یقین ہے کہ بہت جلد کل اثاثہ فروخت کر کے کل سرمایہ لیکر ہندوستان چلی آؤں گی تم پریشان نہ ہونا میرے اندازہ میں ۳ ماہ کا وقفہ لگیگا۔ اس درمیان میں تم کو خطوط لکھتی رہوں گی۔ اس میں شک نہیں کہ تم مجھ کو وفادار تصور کرتے ہو مگر مزید اطمینان کے لئے میں نے لکھنؤ کی کل جایداد کا بیعنامہ تمھارے نام کر دیا ہے۔ کاغذات میرے بکس میں موجود ہیں جسوقت یہ خط تم کو ملیگا میں بمبئی سے بہت دور نکل گئی ہوں گی۔ جہاز مرولیسبرگ ٹھیک سوا بارہ بجے چھوٹ جائے گا۔ میں فرانس جارہی ہوں تم آج ہی لکھنؤ واپس چلے جاؤ اور تین ماہ انتظار کرو۔ پھر خدا وہ دن لائے کہ ہم تم دونوں صحن باغ میں شام کے وقت بیٹھے ہوئے ہوں، گانا ہو رہا ہو تم اپنی غزلیں پڑھتے ہو اور میں سنتی ہوں۔ چند روز اور انتظار کرو۔

راقمہ

تمھاری صوفیہ

مکرر یہ کہ میرے باغ کو درست رکھنا۔۔۔۔۔[1] کے درخت جو میں نے لگائے ہیں اُن کا مجھے بہت خیال ہے مالی پر تاکید رکھنا۔ جانے نہ پائیں۔

مرزا رسوا کو بہت قلق ہوا اور قلق ہونے کی بات بھی تھی بہ حسرت و یاس لکھنؤ واپس آ گئے۔ ایک خط صوفیہ کا عدن سے آیا دو تین خط پیرس سے بھی آئے ۳ ماہ کے بعد ایک تار بھی آیا کہ "میں آج یوٹوبیا جہاز سے ہندوستان روانہ ہوتی ہوں"۔ مگر وہ جہاز کبھی ساحل ہند پر لنگر انداز نہ ہوا!

مرزا رسوا کے احباب کا خیال ہے کہ شاید وہ جہاز ڈوب گیا یا مس صوفیہ نے کسی سے شادی کر لی اور مرزا رسوا کو جھوٹا تار دیدیا۔

مشیر احمد علوی - بی - اے

مثنوی نالۂ رُسوا

یہی کوٹھی تھی جس میں رہتا ہوں — صدمۂ انتظار سہتا ہوں
ایک صاحب تھے پہلے اس میں مقیم — صاحب عقل اور عقیل و فہیم
ایک لڑکی تھی اُن کی حور لقا — حُسن میں مہر و ماہ سے بھی سوا

---

[1] عبارت پڑھی نہیں گئی اس لئے نقطہ ڈال دئے گئے۔

کیا کہوں تجھ سے کیسی صورت تھی
ے یہ تصویر ایسی صورت تھی

دیکھ تو کس بلا کی صورت ہے
یہی میری قضا کی صورت ہے

ایسی کافر نظر نہ دیکھی تھی
ایسی بیداد گر نہ دیکھی تھی

دیکھ اس چشم نیم باز کو دیکھ
اس نگاہ کرشمہ ساز کو دیکھ

دیکھ یہ شوخیاں تبسم کی
سوچ پھر خوبیاں تکلم کی

جس کی تصویر کھینچنا ہو محال
کس طرح پہونچے اسکو وہم و خیال

کیسی سرخ و سپید رنگت تھی
گورے پن پر ادا قیامت تھی

اُن کے دادا کا تھا فرانس وطن
اور نانا تھے ساکن لندن

ہوئے ماں باپ ہند میں پیدا
دل سے اس سرزمیں پہ تھے شیدا

لکھنؤ میں یہ خود ہوئیں پیدا
تھا یہی شہر جائے نشو و نما

اُن کی دایہ بھی لکھنؤ کی تھی
اُن کی آیا بھی لکھنؤ کی تھی

بولتی تھیں زبان اُردو صاف
کس قدر با محاورہ شفاف

ان کی تقریر بھی شریفانہ
یوں ہی سارنگ تھا ظریفانہ

میرے عمّوی نام دار و غیور
جو کہ ہیں سارے شہر میں مشہور

فوج شاہی میں تھے کمان افسر
اُن کے احسان تھے انکے والد پر

غدر میں اپنے گھر میں کر کے نہاں
دشمنوں سے بچائی ان کی جاں،

عورتوں میں بڑی ملنساری
مدتوں تک یہ رسم تھی جاری

میم صاحب کبھی یہاں آتیں،
کبھی میری بچی وہاں جاتیں

آدمی روز آتے جاتے تھے
حصہ بخرے بھی آتے جاتے تھے

میم صاحب تھیں اپنے دل سے نیک
ہر بڑے دن کو بھیجتی تھیں کیک

مدتوں تک یہ رسم جاری تھا
واہ کیا پاس وضعداری تھا

اگلے لوگوں میں کیا محبت تھی — کس قدر سچی بے ریا محبت تھی
گو کہ مذہب خلاف تھا ان کا — قلب اندر سے صاف تھا اُن کا
یہ مسلمان تھے وہ عیسائی — کچھ نہ ہرگز دلوں میں بات آئی
وہ تعصب کو جانتے ہی نہ تھے — ایسی باتوں کو مانتے ہی نہ تھے
ذکر مذہب تھا ان میں ناممکن — دل دکھائیں کسی کا کیا ممکن

کس سے پوچھیں کدھر گئے وہ لوگ — ہائے افسوس مر گئے وہ لوگ
جس زمانہ میں تھا یہ رسم و راہ — جن دنوں تھا یہ چاہتوں کا نباہ
صوفیہ سے ہوئی مجھے الفت — بڑھ گئی رفتہ رفتہ کچھ وحشت
دل نازک کا خون ہو ہی گیا — رفتہ رفتہ جنون ہو ہی گیا
بس کہ یہ ربط جانبین سے تھا — کل اسے تھی نہ میں ہی چین سے تھا
سوئے ظن پر نظر نہ تھی ہم کو — نیک و بد کی خبر نہ تھی ہم کو

عشق صادق تھا پاک اُلفت تھی — مجھ سے بڑھ کر اسے محبت تھی
وہ لڑکپن وہ کھیل کود کے سن — یاد آتے ہیں اب وہ بچپن کے دن
وہ زمانہ جو یاد آتا ہے — دل پہ اک سانپ لوٹ جاتا ہے

جبکہ عمو نے انتقال کیا — میں نے اپنا عجیب حال کیا
ان کو مجھ سے کمال اُلفت تھی — مجھ کو ان سے بڑی محبت تھی،
پھر چچی صاحبہ نے رحلت کی — ان کو بھی موت نے نہ مہلت دی
اسی اثنا میں مر گئے صاحب — اس جہاں سے گزر گئے صاحب
میم صاحب بھی کر چکی تھیں قضا — صوفیہ گھر میں ہو گئی تنہا

الغرض دونوں گھر تباہ ہوئے — وہ اُدھر ہم ادھر تباہ ہوئے
گو کہ جانا میرا مناسب تھا — بعض وجہوں سے نامناسب تھا

گرچہ دعوے تھا جاں فشانی کا — خوف تھا مجھ کو بدگمانی کا،
گو کہ یارائے ضبط مجھ کو نہ تھا — مگر ایسا بھی خبط مجھ کو نہ تھا
کہ میری وجہ سے وہ ہو بدنام — ایسی باتوں کا تھا برا انجام
کہ مبادا اسے ضرر پہونچے — دور تک عشق کا اثر پہونچے

سر پہ آئی بلا نہیں ٹلتی — سچ تو یہ ہے قضا نہیں ٹلتی
تھا مرے دل میں ایک یہ بھی خیال — میں ہوں نادار وہ ہے صاحب مال
اجنبی قوم غیر مذہب ہے — بات اتنی بھی جائے جواب ہے

خط میں تحریر تھا ڈیر رسوا — مدتوں سے تجھے نہیں دیکھا
ہم پہ کیا کیا مصیبتیں گزریں — کیسی کیسی قیامتیں گزریں
تم نے اک دن خبر نہ لی آ کے — یہ توقع ہمیں نہ تھی تم سے
کیا بزرگوں ہی تک تھی غم خواری — کیا ہوئی ہائے وہ ملنساری
یاد کیونکر نہ آئیں اگلے لوگ — فی الحقیقت وہی تھے اچھے لوگ

تم وہ سب رسم وراہ بھول گئے — دوستی کا نباہ بھول گئے
کیا وہ بچپن کے کھیل یاد نہیں — وہ لڑکپن کے میل یاد نہیں
ابھی اجڑا نہیں وہ گھر وہ باغ — دور اتنا نہیں وہ گھر وہ باغ
چلتے پھرتے اگر نکل آتے — آپ کے پاؤں کچھ نہ تھک جاتے
کس قدر تم بھی بے مروت ہو — نوج تم سے کسی کو اُلفت ہو،

مجھ کو گھر کا پتا نہ تھا معلوم — تم کہاں ہو ذرا نہ تھا معلوم
کھد گیا جب سے وہ قدیم مکاں — نہیں معلوم مجھ کو ٹھیک نشاں

تم بہت یاد آئے ہو کل سے — خط لکھا ہے یہ میں نے اُلکل سے

سنتی ہوں ماٹنیر میں ہو تم — جو یہ سچ ہے تو خط نہ ہوگا گم
کیا عجب ٹھیک وقت پر پہونچے — جلد لکھنا جواب اگر پہونچے
بلکہ کیا ہے جواب کی حاجت — خود ہی آؤ اگر ملے فرصت
جانتی ہوں سبب نہ آنے کا، — لغو ہے عذر منھ چھپانے کا

تم ہو انساں تو میں بھی ہوں انساں — کیا سمجھتے ہو مجھ کو تم ناداں
میں سمجھتی ہوں ہاں غیور ہو تم — زعم باطل میں اپنے دور ہو تم
خیر یہ ہے کہ دل سے ہو تم صاف — دوستانہ شکایتیں ہوں معاف
منتظر لطف بے نہایت کی — آپ کی دوست بے ریا صوفی

بادۂ مشک بار لا ساقی — اور پیوں اور تو پلا ساقی
اب نہیں تابِ انتظار مجھے — بھر کے دے جام خوشگوار مجھے
مرحبا با نصیب با قسمت — راہ پر آئے تم خوشا قسمت
آسماں مجھ کو دے مبارکباد — کہ ہوا قید غم سے میں آزاد

قاصد شوق حرز جاں لایا — نامہ یار مہرباں لایا
میں ہوں اب اور داستان حبیب — نہ غم پاسباں نہ خوف رقیب
خانۂ دل سے کلفتیں نکلیں — حسب دل خواہ حسرتیں نکلیں

آج گویا کہ ہے برات کی رات — اور ہے انتظار رات کی رات
مژدہ اے دل کہ عید کا دن ہے — مژدہ اے چشم دید کا دن ہے

دل سے حیلے ہزار ہا کر کے — رات کاٹی خدا خدا کر کے
صبح ہوتے ہی اُٹھ کے بستر سے — ہاتھ منھ دھو کے ہم چلے گھر سے
عازم کوئے گلعذار ہوئے — جا کر اُس شوخ سے دوچار ہوئے

دوستانہ لی وہ جان جہاں — اس کی باتوں پہ دل ہوا قرباں
ذکر افلاس نامناسب تھا — ان سے کہتے یہ کیا مناسب تھا
پھر خطائیں مری معاف ہوئیں — گتھیاں جو پڑی تھیں صاف ہوئیں
باتوں باتوں میں اس نے سحر کیا — ہاتھ میں ہاتھ دے کے قول لیا

پھر ہوئے درفشاں لب گفتار — اس طرح حرف زن ہوئی وہ فگار
بات یہ ہے کہ میں ہوں عورت ذات — اور علاقہ کی فکر ہے دن رات
مجھ سے یہ کام ہو نہیں سکتا — کچھ سرانجام ہو نہیں سکتا
اس میں کچھ جد و کد کی حاجت ہے — کچھ تمہاری مدد کی حاجت ہے

میرے لایق یہ کاروبار نہیں — غیر کا مجھ کو اعتبار نہیں
ہو کے میری طرف سے تم مختار — جانچ لو کاغذات اسامی وار
خود علاقہ کا بندوبست کرو — جو کہ سرکش ہیں ان کو پست کرو
نوکری کا نہ سلسلہ سمجھو — اس کو اپنا معاملہ سمجھو
الغرض بعد حجت بسیار — اس نے ضد کر کے لے لیا اقرار
دوسرے دن سے کام کرنے لگا — گھر کا سب انتظام کرنے لگا

(نگار) حال ہی میں جناب تمکین کاظمی کا بھی ایک مضمون اسی مثنوی پر کسی رسالہ میں شایع ہوا ہے اور جہانتک مجھے یاد پڑتا ہے ان کا نسخہ زیادہ مکمل ہے اس لئے میں مسٹر مشیر احمد صاحب علوی کو مشورہ دوں گا کہ وہ جناب تمکین کاظمی سے خط و کتابت کریں اور دونوں نسخے سامنے رکھکر اس مثنوی کی تکمیل کریں — اس میں شک نہیں کہ فن کے لحاظ سے اس مثنوی میں کوئی خاص بات نہیں ہے بلکہ بعض بعض جگہ ایسی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں کہ مرزا رسوا ایسے صاحب زبان سے انھیں منسوب کرتے ہوئے پس و پیش ہوتا ہے۔ تاہم اس لحاظ سے کہ اس مثنوی کا تعلق بلاواسطہ امراؤ جان سے بھی ہے (اور امراؤ جان کا فسانہ مرزا رسوا کی بہترین ادبی یادگار ہے) اس لئے مثنوی نالۂ رسوا کی چھان بین کرنا لطف سے خالی نہیں ہے لکھنؤ میں اب بھی بعض فرانسیسی خاندان پائے جاتے ہیں اور اسی معاشرت و تہذیب کے پابند ہیں جو مس صوفیہ کی بتائی جاتی ہے اس لئے میں مسٹر مشیر احمد صاحب علوی کو مشورہ دونگا کہ وہ ان لوگوں سے بھی تحقیق کریں ممکن ہے صوفیہ کے کچھ اور حالات معلوم ہو جائیں

مطبوعات موصولہ

تمدن عتیق یہ تصنیف نتیجہ ہے جناب ابوظفر عبدالواحد ام۔ اے اور محمد عطاء الرحمان صاحب بی اے کی متحدہ کوششوں کا۔ اس کتاب میں ابتداء آفرینش سے لیکر عبرانیوں تک کے زمانہ کا حال لکھا گیا ہے اور نہایت صاف و شستہ زبان میں، سامرستان، مصر اور اشوریہ کے تمدن سے بھی اسی سلسلہ میں بحث کی گئی ہے اور جا بجا نقوش و تصاویر سے اسے اور زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔ یہ کتاب مجلد شائع ہوئی ہے اور تین روپیہ میں حیدرآباد کے کتب فروشوں سے مل سکتی ہے۔

شب چراغ مختصر سا مجموعہ ہے جناب صادق ضیائی۔ اسے کے آٹھ انشاؤں کا۔ ضیا بہت اچھا ذوق ادب رکھتے ہیں اور نظم و نثر دونوں میں فکر کرتے ہیں۔ یہ فسانے اپنے پلاٹ کیرکٹر نگاری، طرز تحریر، اور محاسن انشا پردازی کے لحاظ سے کافی دلچسپ ہیں۔ قیمت درج نہیں ہے لیکن جو صاحب اس کا مطالعہ کرنا چاہیں وہ قصر الادب آگرہ کے پتہ سے طلب کر سکتے ہیں۔

اسنے کہا قاضی عبدالغفار صاحب کی تازہ ترین فکر ہے جس میں انھوں نے مصر کے مشہور انشا پرداز خلیل جبران سے استفادہ کیا ہے۔

خلیل جبران مصر کے اس دور کا انشا پرداز ہے جب سر رابندر ناتھ ٹیگور کو گیتانجلی پر نوبل پرائز ملا تھا اور ساری دنیا پر "ٹیگوری رنگ" کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ چنانچہ قاضی صاحب کی یہ چیز بھی اسی رنگ کی ہے اور سوائے اس کے کہ ہم اسے چند خوبصورت الفاظ کا مجموعہ کہہ سکیں، کوئی اور بات اس میں نظر نہیں آتی۔ اس کی قیمت عہ رکھی گئی ہے جو بہت زیادہ ہے اور دارالادب پنجاب سے مل سکتی ہے۔

میری کہانی پنڈت جواہر لال نہرو کی "آپ بیتی" کا اردو ترجمہ ہے جسے جامعہ ملیہ نے شائع کیا ہے اسوقت پنڈت جی نہ صرف ہندوستان، بلکہ دنیا کی مخصوص ہستیوں میں شمار کئے جاتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ایسے خوش فکر و صحیح الدماغ انسان بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ پنڈت جی نہ صرف ملک کے سیاسی رہنما ہیں بلکہ وہ نہایت ہی باہوش و باخبر اہل قلم بھی ہیں، چنانچہ اسوقت تک انکی متعدد تصانیف شائع ہو کر دنیا میں مقبول ہو چکی ہیں۔

یہ تصنیف انھوں نے جیل کے اندر لکھی ہے اور اپنے حالات آغاز طفلی سے بمبئی کانگرس کے زمانہ تک اس میں قلمبند کئے ہیں۔ اس کا اُردو ترجمہ جامعۂ ملیہ نے دو جلدوں میں شائع کیا ہے جو غالباً کیا یقیناً ڈاکٹر عابد حسین اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی متحدہ مساعی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے اس کتاب کی خوبی کے متعلق سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ حسن اُس پر یوش کا اور پھر بیاں اپنا

یہ کتاب یونتو صرف پنڈت جی کے حالات پر مشتمل ہے لیکن چونکہ پنڈت جی کی تمامتر زندگی سیاسی ماحول میں بسر ہوئی ہے اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند کی سیاسیات پر یہ تصنیف بہترین تبصرہ ہے اور ہر وہ شخص جو یہاں کے معاملات سے دلچسپی رکھتا ہے اس کے لئے اس کا پڑھنا از کس ضروری ہے۔

کتاب دو جلدوں میں نہایت دلکش طباعت و کتابت کے ساتھ شائع ہوئی ہے اور چار روپیہ میں مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی سے مل سکتی ہے۔

جواہر سخن پہلی اور دوسری جلد ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد نے ۲۷ء میں طے کیا تھا کہ اُردو کے مشہور شعراء کا منتخب کلام معہ مختصر تذکرہ کے شائع کیا جائے اور جمع و ترتیب کی خدمت مولانا کیفی چریاکوٹی کے سپرد کی گئی تھی جو وہاں اُردو اسکالر کی حیثیت سے متوسل ہیں چنانچہ اس کی پہلی جلد ۳۳ء میں اور دوسری جلد ۳۵ء میں شائع ہوئی ہے۔

اسلوب کار یہ رکھا گیا ہے کہ چھ حضرات کی ایک انتظامیہ کمیٹی مقرر کی گئی ہے جن میں سے ایک ایک جلد کی نظر ثانی ہر ممبر کے سپرد ہے۔ چنانچہ پہلی جلد کی نظر ثانی سید سلیمان صاحب ندوی نے کی ہے اور دوسری کی جناب سید مسعود حسن صاحب ادیب ام۔ اے نے

اول جلد کا آغاز ایک تعارف سے ہوتا ہے جس میں ڈاکٹر تارا چند صاحب جنرل سکرٹری اکاڈیمی نے اس تذکرہ کی خصوصیات کو مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے، اس کے بعد چند صفحات تمہید کے ہیں جن میں حد درجہ اختصار بلکہ اقتصار کے ساتھ اُردو زبان کے آغاز و ترقی پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور پھر ایک مجمل بیان اُردو شاعری کے دورِ اول کی خصوصیات کا ہے۔

اس جلد کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلا وہ جس میں شعرار دکن کے کلام کا انتخاب ہے اور وجہی سے شروع ہو کر لچھمی نراین شفیق پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرے حصہ کا آغاز سراج الدین علی خاں آرزو سے ہوتا ہے اور اختتام بقاء اللہ بقا پر

دوسری جلد جناب سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب کی نظر ثانی کے بعد شائع ہوئی ہے

اور ان کا دیباچہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اصل مسودہ میں کافی حذف و اضافہ کیا ہے اور ترمیم و تنسیخ بھی جابجا کی ہے۔

: یہ جلد دوسرے دور سے متعلق ہے اور میر سے شروع ہوکر بسمل (کسی غیر معروف شاعر) پر ختم ہوتی ہے۔ (یہ میں نے فہرست کو دیکھ کر لکھا ہے ورنہ اصل کتاب میں بسمل کا ذکر موجود ہی نہیں ہے)

اس میں شک نہیں کہ جس حد تک ایک انسان کے استقصار کا تعلق ہے یہ دونوں جلدیں کسی طرح قابل اعتراض نہیں لیکن اگر اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے کہ نظر ثانی کا کام ایک کمیٹی کے سپرد ہوا تھا تو ہم کو اس میں چند در چند نقائص نظر آتے ہیں۔ اول تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ دور کی تقسیم کس لحاظ سے کی گئی ہے کیونکہ بہ لحاظ زمانہ بھی اس میں جابجا غلطیاں نظر آتی ہیں اور نسبت شاگردی کے لحاظ سے بھی۔ مثلاً سودا کا ذکر دوسرے دور میں کیا جاتا ہے اور ان کے ہمعصر ضیا کو پہلے دور میں رکھا گیا ہے۔ یا یہ کہ جعفر علی حسرت کو پہلے دور میں شامل کیا گیا ہے حالانکہ وہ میر و مصحفی کے ہمعصر تھے۔

دوسرے یہ کہ استقصار میں بھی کافی سعی سے کام نہیں لیا گیا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ خواجہ میر درد کے شاگردوں میں میر محمدی بیدار کا ذکر تو کیا جاتا ہے جن کے کلام میں کوئی خاص بات نہیں اور حکیم ثناء اللہ فراق کو چھوڑ دیا جاتا ہے جو بقول آزاد خواجہ میر درد کے مشہور شاگرد تھے۔

علاوہ اس کے شعراء کے کلام پر اول تو کوئی انتقاد نہیں کیا گیا اور کہیں کہیں اگر کیا بھی گیا ہے تو وہ بہت تشنہ و نامکمل ہے۔

شعراء کے سنین ولادت و وفات کی تحقیق میں بھی کافی جستجو نہیں کی گئی اور طباعت کی غلطیاں تو اس قدر کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ ان کا ذکر کرنا ہی فضول ہے۔

الغرض یہ تذکرہ ہماری توقع سے کہیں فروتر ہے اور ضرورت ہے کہ آئندہ جو جلدیں شایع کی جائیں ان کی ترتیب میں زیادہ محنت و کاوش سے کام لیا جائے۔ پہلی جلد کی قیمت للعہ ہے اور دوسری کی آٹھ روپیہ۔

ملنے کا پتہ:۔ کتابستان الہ آباد۔

مشورہ آگرہ نمبر آگرہ کا یہ رسالہ بہت عرصہ سے جاری ہے اور اس کا مقصود زیادہ تر چمڑے اور جوتے کی مقامی تجارت کا تحفظ ہے اور بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ وہاں جتنے کارخانے اس مخصوص تجارت کے ہیں وہ سب متفقہ و متحدہ قوت کے ساتھ اس مقصد کی تکمیل کے خواہاں ہیں۔

جولائی ۳۶ء کا رسالہ جس کا نام آگرہ نمبر ہے حال ہی میں ہمیں موصول ہوا ہے اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا

کہ اسوقت تک ہندوستان کی کسی تجارت پیشہ جماعت کی طرف سے تجارتی پروپاگنڈا یا اشتہار کی ایسی مفید و دلکش صورت اختیار نہیں کی گئی۔

یہ نمبر تقریباً ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور جفت سازی و جفت فروشی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس سے اس میں بحث نہ کی گئی ہو۔ اسی کے ساتھ ایک ضمیمہ ۲۰۰ صفحات کا "دورِ ادب" کے عنوان سے بھی شامل کیا گیا ہے جس میں اکبر آباد کی ادبی تاریخ کو آٹھ دور میں تقسیم کرکے ہر دور کے مشہور شعراء کا تذکرہ معہ ان کی تصاویر و انتخاب کلام کے درج کیا گیا ہے اور اگر اس نمبر میں اس ضمیمہ کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تو بھی اس کی مقبولیت کے لئے یہی کافی تھا۔

اس میں ایک ڈائرکٹری بھی شامل ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس وقت آگرہ میں کتنے کارخانے جفت سازی و تجارت چرم کے پائے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مالک کارخانہ کی تصویر بھی مع مختصر حالات کے دیدی گئی ہے۔ طباعت و کتابت بھی نہایت پاکیزہ ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

پیلی یاس اور میل ساند

مارس میٹرلنک نہ صرف بلجیم بلکہ یورپ کے ان چند مشہور تمثیل نگاروں میں سے ہے جنھوں نے اپنے اس فن کے ذریعہ سے شہرت دوام حاصل کرلی ہے۔ فطرت کا عمیق مطالعہ اور جزئیات کی تصویر کشی اس کی خصوصیات خاصہ ہیں۔ اس نے متعدد ڈرامے لکھے جن میں ایک یہ بھی ہے۔

اس کا اردو ترجمہ جناب تمنائی نے کیا ہے اور شروع میں ایک مبسوط مقدمہ پروفیسر آرزو جلیلی کا شامل کر دیا گیا ہے جس سے مٹرلنک کی سیرت و خصوصیات انشاپردازی پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ترجمہ بھی بہت صاف و سلیس ہے۔

پنجاب بک ڈپو لاہور نے اسے شایع کیا ہے اور بارہ آنے اسکی قیمت درج ہے۔

فلسفۂ برگساں

تصنیف ہے جناب میر حسن الدین صاحب بی۔ اے ایل۔ ایل۔ بی (عثمانیہ) کی جس میں مشہور فلسفی برگساں کے نظریوں پر اجمالی گفتگو کی گئی ہے۔

فاضل مصنف نے کوشش کی ہے کہ صاف و سادہ زبان میں وہ برگساں کے فلسفہ کو سمجھا سکیں، جس میں وہ کسی جگہ کامیاب ہوئے ہیں اور کسی جگہ ناکام۔ انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ کرنے میں بھی بعض جگہ انھوں نے ضرورت سے زیادہ ذہانت صرف کی ہے۔ تاہم بہ حیثیت مجموعی کتاب مطالعہ کے قابل ہے۔

قیمت بہ ہے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

کتابچہ نمبر ۱

مجموعہ ہے آقا سید محمد علی سابق پروفیسر نظام کالج کے ان چھ لکچروں کا جو حیدرآباد لاسلکی

نشرگاہ سے شایع ہو چکے ہیں۔

ان میں سے چار لکچر تو فارسی شاعری سے متعلق ہیں جن میں فاضل مقرر نے نہایت قابلیت کے ساتھ فارسی شاعری کی تاریخ اور اس کے درجہ بدرجہ تغیرات پر روشنی ڈالی ہے۔

پانچویں لکچر میں زبان اُردو کے ماخذ سے بحث کی ہے اور چھٹا لکچر غالب کی فارسی شاعری پر ہے۔ ظاہر ہے کہ ریڈیو کے لکچر میں بہت زیادہ اسرار و غوامض سے بحث نہیں کی جا سکتی اور افادۂ عام کا پہلو زیادہ پیش نظر رہتا ہے تاہم آقا سید محمد علی صاحب نے ایرانی النسل ہونے کی حیثیت سے ان مختصر تقریروں میں بھی وہ کچھ بیان کر دیا ہے جو آپ کو اکثر بڑی کتابوں میں بھی نہیں مل سکتا۔

ماخذِ اُردو اور غالب کی فارسی شاعری کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ یقیناً بہت تشنہ ہے بلکہ ایک حد تک ناقص۔

یہ مجموعہ ایک روپیہ میں مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن سے مل سکتا ہے۔

رباعیات احقر مختصر سا مجموعہ ہے جناب احقر کی رباعیات کا۔ رباعیاں صاف ہیں اور ایک حد تک بے عیب۔ طباعت و کتابت نہایت معمولی ہے۔ قیمت ۳ر ہے اور ملنے کا پتہ ابوالفتح سرمد۔ شیرپور۔ بہار شریف (پٹنہ)

ضبط تولید اس مختصر رسالہ میں کسی "کثیر الاولاد" نے عقلی و نقلی دلایل سے ضبط تولید کے مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے اور آخر میں وہ عملی تدابیر بھی بتادی ہیں جن سے ضبط تولید ممکن ہے۔ ایجوکیشنل بک ڈپو امراؤتی (برار) ملنے کا پتہ ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

"نگار" کے پُرانے پرچے

حسب تفصیل ذیل دفتر میں موجود ہیں اور علاوہ محصول اس قیمت پر مل سکتے ہیں جو اُنکے آگے درج ہے:-

(سنہ ۲۲ء) ستمبر ۴ر — (سنہ ۲۳ء) مئی ۴ر — (سنہ ۲۴ء) جنوری۔ فروری و اگست ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۲۶ء) جنوری، جون، اکتوبر و نومبر ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۲۷ء) اپریل، مئی و جون ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۰ء) ستمبر، اکتوبر و نومبر ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۳۱ء) جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۲ء) جنوری (غالب نمبر) ۱۲ر — فروری تا دسمبر علاوہ اپریل ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۳۴ء) فروری تا جون و اکتوبر ۶ر فی پرچہ (سنہ ۳۵ء) جنوری (اُردو شاعری نمبر) ۸ر۔ فروری ۸ر فی پرچہ —

منیجر نگار لکھنؤ

حیات بعد الموت

اگست سنہ حال کے نگار میں حیات بعد الموت کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا ہے اسکی نسبت اپنے واردات قلبیہ ناظرین نگار کی خدمت میں پیش کرتا ہوں :-

تحریر مذکور چونکہ تمام عقلائے زمانہ کے نقطۂ خیال سے بالکل مطابقت رکھتی ہے دل میں تمنا رکھتا ہوں کہ کاش وہ حقیقت حال کے بھی مطابق ہو۔ میں نے اسے عقلائے زمانہ کے نقطۂ خیال سے مطابق اسلئے کہا ہے کہ جو عقلاء مذہب سے بیگانہ ہیں ان کا بالطبع یہی خیال ہونا چاہئے اور جو مذہب کو مانتے ہیں وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ مذہب کی بنیاد دو ایسی چیزوں پر ہے جن کا عقلی ثبوت کوئی نہیں۔ ایک یہ کہ دنیا کا پیدا کرنے والا ایک قادر مطلق اور علم و ارادہ کے اوصاف کمال سے متصف خدائے لایزال ہے۔ دوسرے یہ کہ انسان مرنے کے بعد موجود رہتا ہے۔ ان دونوں عقیدوں کو جو شخص بغیر دلیل کے مانتا ہے یا یوں کہئے کہ جس شخص کی فطرت میں یہ دونوں عقیدے مرکوز ہیں وہ مذہب کے بغیر رہ نہیں سکتا اور جو ان کا منکر ہے وہ مذہب کی طرف آ نہیں سکتا۔ یہ بحث الگ ہے کہ جس خیال کو ہر زمانے میں عالم و جاہل انسانوں کی بہت بڑی تعداد مانتی ہو اسے ان کی فطرت اور جو بعض افراد نہ مانتے ہوں انھیں مادر زاد اندھوں اور دیوانوں کی طرح پیدائشی بیمار کہنا چاہئے یا فطری جذبات کو دریافت کرنے کے لئے کوئی اور معیار مقرر ہے۔ اس بحث کو چھوڑ کر میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ جو عاقل اپنے مسلمات سے یا اپنے فطری جذبہ سے علاحدہ ہو کر محض عقل کی رہنمائی سے غور کرے وہ اسی نتیجہ پر پہونچ سکتا ہے جو صاحب مضمون نے ظاہر فرمایا۔

مجھے آنجناب کے تمام مقالہ میں سے صرف ایک نکتہ پر اعتراض ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ بعض مریضوں کا آپریشن کیا جاتا ہے تو وہ چند منٹ تک زیست سے محروم رہ کر دوبارہ زندہ ہوتے ہیں اور زمانۂ بعد الموت کی کوئی کیفیت بیان نہیں کرتے۔ یہی صورت ہمیشہ کے لئے مرنے کے بعد ہوتی ہوگی۔ یہ قیاس استدلالی قاعدہ پر پورا نہیں اترتا۔ جو شخص آپریشن کے وقت چند منٹ کے لئے مرا ہے اس کے عزرائیل ڈاکٹر ہیں جو اسکی روح کو عالم بالا تک لیجا نہیں سکتے۔ وہ اسی فضا میں بھٹکتی رہتی ہوگی اور مناسب موقع پا کر پھر آ گھستی ہوگی وہ اسی طرح بے خبر رہتی ہوگی جیسے آدمی غفلت کی نیند میں سوتا ہو تو بتائے کیا ؟ - حیات بعد الموت کا عقیدہ

اُس موت کی نسبت ہے جس کا عزرائیل اُسے اتنی دور لیجاتا ہے کہ وہ موجودہ جسم میں کسی ڈاکٹر کی کوشش سے اور کسی ترکیب سے داخل نہیں ہو سکتی تو اس عارضی موت کی کیفیت کو حقیقی موت پر کیونکر منطبق کر سکتے ہیں دوسرے موت سے لیکر قیامت تک کا زمانہ یا موت سے لیکر دوبارہ کسی گھوڑے یا گدھے کے جسم میں حلول کرنے تک کا زمانہ ہے بھی ایسا زمانہ جس کی کیفیات پر تمام مذاہب اور تمام مذہبی فرقے متفق نہیں ہیں۔ روحانی جزا و سزا کی تھیوری جو سر سید نے بزعم خود فلسفیانہ خیال سے مطابق کرنے کے لئے پیش کی ہے اسکی بنا پر بیشک کہہ سکتے ہیں کہ مرنے کے بعد روح موجود ہے تو رنج و راحت سے بھی مرتے ہی شناسا ہو جاتی ہوگی اور اگر آپریشن کی حالت سے فی الواقع ثابت ہو گیا ہو کہ اسے رنج و راحت سے واسطہ نہیں تو حیات بعد الموت کا مسئلہ بھی غلط ہو جائے گا لیکن جسمانی حشر و نشر ماننے والے تو یہ کہتے ہیں کہ روح اگرچہ جداگانہ ہستی رکھتی ہے مگر اس میں جسم کے بغیر کوئی احساس ہوتا ہے نہ کوئی کام کر سکتی ہے۔ اسے دنیا میں بلایا گیا تو جسم کا مکان فروکش ہونے کے لئے مہیا ہوا۔ عاقبت میں بھی طلبی ہوگی تو جسمانی سواری بھیجنی پڑیگی اور جسم میں در آنے کے بعد ہی وہ احساس سے متصف ہوگی کیونکہ یہ قوت دماغ میں ودیعت ہے اور دماغ جسمانی حصہ ہے اور اس لئے احساس بچپن جوانی اور بڑھاپے کے اندر جسمانی قاعدے کے مطابق کمزوری اور طاقت میں متفاوت ہوتا ہے۔ احساس اگر روح میں ہوتا تو زندگی کے ہر لمحے میں یکساں قوت کے ساتھ موجود رہتا۔ روح کی واحد قوت خواہش ہے (Will) یہ خواہش تمام مراحل زیست کے اندر پوری قوت کے ساتھ موجود رہتی ہے۔ پیدا ہوتے ہی خوراک کی خواہش ہوتی ہے جوانی میں مختلف چیزوں کو اپنا مطلوب بناتی ہے بڑھاپے میں راحت کی خواہش ہوتی ہے۔ خواہش موجود ضرور رہتی ہے۔ یہ محض روح کی طرف منسوب ہو سکتی ہے اور روح چونکہ احساس سے محروم ہے اس لئے وہ مفید اور مضر خواہش میں تمیز نہیں رکھتی اور ڈاکٹروں کی عمر کا بڑا حصہ مریضوں اور تندرستوں کو ان کی مضر خواہشوں کے روکنے میں صرف ہوتا ہے۔ اچھا تو جب احساس روح کے اندر موجود ہی نہیں تو عقل جو احساسات کے مجموعے کا نام ہے روح میں کہاں ہوگی اور اس لئے وہ اپنی خواہش کو تسکین دینے کے لئے جسم کی محتاج ہوگی اور یہیں آنکر اسے رنج و راحت سے شناسا ہونے کا موقع ملتا ہوگا۔ مرنے کے بعد آپریشن کی موت ہو یا حقیقی موت وہ چونکہ جسم سے جدا ہے احساسی کیفیتوں سے کیا آشنا ہو۔ قرآن میں زمانہ قبل الحشر کی نسبت فرمایا گیا ہے۔ " کانہم یوم یرونہا لم یلبثوا الا عشیۃ او ضحاہا " یعنے قیامت کے دن ہزاروں سال کے بعد زندہ ہونے والے بھی وہی کہیں گے جو سو کر اُٹھنے والا کہتا ہے کہ ہمیں قبر میں ایک شام گزری ہوگی۔ اشاید صبح تک رہے ہوں گے "۔ یہ آیت بھی اسی تھیوری پر منطبق ہے کہ جسم سے جدا ہو کر روح کو کچھ خبر نہیں رہتی۔ جب پھر کسی جسم کے ساتھ تعلق ہوتا ہے تو گویا وہ جاگ اُٹھتی ہے۔ پس آپریشن کے بعد زندہ ہو کر وہ نہ کچھ بتا سکتی ہے نہ

اس پر کوئی نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ بلکہ ابھی صاحب مضمون کو یہ عقدہ حل کرنا باقی رہتا ہے کہ اگر انسان اور بالعموم تمام جاندار جسم ہی جسم رکھتے ہیں اور روح کوئی چیز نہیں تو خواہش جسم کی تمام قوتوں ۔ کا مانند عمر کے مختلف مدارج میں کم اور زیادہ کیوں نہیں ہوتی اور ہمیشہ یکساں زور کے ساتھ کیوں موجود رہتی ہے۔ اس تنقیح کا بار ثبوت مضمون نگار اور ان کے ہمخیالوں پر ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور عقدہ کا حل دریافت طلب ہے۔

(۱) دنیا کے تمام کارخانہ کو دیکھئے۔ اس میں بے جان اور جاندار مخلوق مقداریں اور تعداد میں بے شمار ہے اور ان میں سے اکثر چیزیں بے جان بھی اور جاندار بھی دوسری چیزوں کو اپنی خوراک بنا کر قایم رہتی ہیں اور خود اور چیزوں کی خوراک بنتی ہیں اور ہر چیز اپنی خوراک حاصل کرنے کے لئے اپنی پوری قوت صرف کرتی ہے۔ مگر انتظام ایسا رکھا گیا ہے کہ خوراک کی اور خوراک لینے والوں کی کوئی نسل اور کوئی قسم ہزاروں سال کے زمانے میں خریج ہوتے اور فنا ہوتے ہوئے دنیا کے پردہ سے بالکل نابود نہیں ہوئی بعض جانداروں کے ڈھانچے دیکھ کر قیاس کیا گیا ہے کہ ان کی نسل ناپید ہو گئی ہے مگر ان کی تعداد موجودہ بیشمار نسلوں اور قسموں کے مقابلہ میں ہیچ ہے اور وہ بھی غالباً صرف اس کلیہ کو ثابت کرنے کے لئے ہے کہ ہر کلیہ میں استثنا ہوتا ہے اور قلیل استثنا کا ہونا کلیہ کے کلیہ ہونے میں حارج نہیں۔ یہ قایم و باقی رکھنے کا اہتمام ایسی دور اندیشی اور ہوشیاری سے کیا جاتا ہے کہ جب کبھی کوئی عام تباہی پھیلانے والا حادثہ یعنے طوفان باد و باراں یا زلزلہ یا سیلاب یا قحط یا وبا دنیا کے کسی حصہ پر مسلط کیا جاتا ہے تو سب چیزوں اور سب جانداروں کو بڑی بیدردی سے پائمال ہوتے دیکھتے ہیں مگر ہر چیز اور ہر جاندار کی کچھ نہ کچھ مقدار اور تعداد کو ان ہی تباہی خیز اسباب اور ان ہی حالات کے اندر بالکل محفوظ رکھکر یا تھوڑا نقصان پہونچا کر بچا لیا جاتا ہے اور انہی باقی ماندہ اشیا کو افزائش دیکر کچھ عرصہ کے اندر تباہی زدہ رقبہ کو پھر سرسبز اور آباد کر دیا جاتا ہے۔

(۲) تمام دنیا ایک مشین ہے جس کے سب پرزے باہمدگر تعاون اور کوآپریٹ کرتے ہیں مگر کبھی ایک پرزے کا جوڑ دوسروں سے توڑ دیتے ہیں اور کسی اور پرزے سے وہی کام لے لیتے ہیں زراعت کے لئے مناسب مقداریں پانی اور ہوا کی ضرورت ہے مگر کبھی پانی کو روک کر ہوا کو ایسا مرطوب کر دیتے ہیں کہ سوکھی کھیتی سرسبز اور بارآور ہو جاتی ہے۔ کبھی پانی دیتے ہیں اور ہوا میں حرارت بھر کر اُسے آگ بناتے اور کھیتی کو جلا دیتے ہیں بیمار کو کبھی منفرت دینے والی چیز شفا دیتی ہے اور کبھی تندرست کو مناسب غذا زہر بنکر ہلاک کر دیتی ہے۔

(۳) اور دیکھئے انسام جسمی میں جسقدر کیمیا رہتے ہیں ان کا اندرونی حال معلوم نہیں۔ قیاس آرائیاں ہیں ہیں مشین کا حال معلوم ہے۔ یہاں بسنے والی مخلوق میں سب سے ممتاز انسان ہے کہ یہ سب سے

کام لیتا ہے۔ سب پر حکومت کرتا ہے۔ اس سے کام لینے والا کوئی نہیں۔ بیشک بعض درندے اس کا گوشت کھا سکتے ہیں۔ بعض حقیر جاندار اس کے جسم پر بیٹھ کر یا اس کے اندر بیٹھ کر اس سے خوراک لیتے ہیں مگر یہ اس لئے کہ وہ بھی گوشت اور پوست رکھتا ہے اور اس حیثیت میں اور جانداروں کے ساتھ شریک ہے اور جس خطہ میں انسان نہ ہو وہاں بھی اس کے گوشت اور پوست سے کام لینے والے اور قسم کے جانداروں پر زندگی بسر کر سکتے اور موجود رہ سکتے ہیں۔ انسان کا امتیازی خاصہ عقل و فہم ہے۔ انسان کے اس خاصہ سے کوئی جاندار کام نہیں لے سکتا اور زندہ انسان پر کسی جاندار کا تسلط نہیں ہوتا۔ پس بحالت مجموعی انسان تمام مخلوق سے فائق۔ سب پر مسلط اور سب کا مخدوم ہے۔ بلکہ زمین سے پرے آسمانی نجوم و کواکب اور فضا کی غیر مرئی (Unseen) مخلوق سب کسی نہ کسی حیثیت سے انسان کو کام دیتی اور فایدہ پہونچاتی ہے۔ اور ہم بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ پیدائش عالم کی یا کم از کم تخلیق زمین کی غرض و غایت انسان ہے۔ یہی وہ سب سے زیادہ خوشنما اور خوشبودار پھول ہے یا سب سے لذیذ اور شیریں ثمر ہے جسے پیدا کرنے کے لئے باغبان نے یہ چمن آراستہ کیا۔ کیونکہ اگر زمین ہموار نہ ہوتی۔ اس میں روشیں نہ بنائی جاتیں۔ اس کے مختلف ٹکڑوں کو گھاس سے سبز نہ کیا جاتا۔ اس میں ہر قسم کے شیریں اور ترش میوے اور پرگل اور خاردار پودے نہ لگائے جاتے تو باغبان کا محبوب پھول اور پھل دینے والا پودہ نہ تنہا کسی جنگل میں اگا ہوا خوشنما ہوتا۔ نہ تنہا پیدا ہونے کی حالت میں قائم رہ سکتا۔ اور پھر انسانی نسل میں سے جو ہستیاں جسمانی دماغی اور روحانی حیثیت میں عوام الناس سے بالاتر ہیں اور جن کے نفوس قدسیہ سے مخلوق کے اندر سب سے زیادہ امن اور انتظام قائم رہ سکتا ہے اور جو خلق خدا کو سب سے زیادہ فایدہ پہونچا سکتی ہیں حقیقت میں انہی کو زیب دیتا ہے کہ باعث تخلیق عالم قرار پائیں اور "لولاک لما خلقت الدنیا" کا خطاب حاصل کریں۔ اور اگر ان میں سے کوئی ہستی ہر حیثیت سے سب پر فائق ہے تو بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ صاحب لولاک وہی ہے۔

اچھا تو اتنی بڑی مخلوق اور اس کے قیام و استمرار کا اتنا بڑا اہتمام۔ اور اس کے مختلف حصوں کا ایسا باہمی ارتباط اور پھر ایک ایک چیز میں مختلف کام دینے کی ایسی قابلیت اور مخلوق کے اندر علوم و انتہا کی ایسی تدریجی ترقی اور اعلیٰ ترین مخلوق کی پیدائش تک پہونچانے کا ایسا انتظام۔ کیا یہ سب مناظر اس امر کو ثابت نہیں کرتے کہ یہ کسی بے شعور مادہ کی محض اپنی فطرت کا تقاضا نہیں۔ بلکہ اپنے مادہ کو پیدا کرنے والی یا ایک اور تھیوری کے مطابق اس مادہ سے کام لینے والی کوئی علم و ارادہ اور حکمت و قدرت میں کمال رکھنے والی ہستی ہے۔

اگر ایسا ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے بڑے پر حکمت نظام کو پیدا کرنے یا جاری کرنے والے نے کیا صرف ایک ہی تھیٹر بنایا ہے جس میں کام کرنے والے تھوڑی دیر کے لئے نمودار ہوتے ہیں اور مختلف حرکتیں

دکھا کر ہمیشہ کے لئے گم ہو جاتے ہیں - کیا یہ ایک تماشا ہے جس کا سامان ایسی دور اندیشی اور دانائی کے ساتھ مہیا کیا گیا مگر کھیلنے والوں کے کھیل پر کوئی نتیجہ مرتب نہ ہوا - نیک بندوں نے نیکی کرنے - نیکی کا درس دینے - نیکی کی خوبیاں سمجھانے اور مخالفت کرنے والوں سے مقابلہ کرنے میں عمریں صرف کیں - مال قربان کیا - اولاد فدا کی اور جان گنوائی - بدوں نے فن و فریب - سرقہ و رہزنی اور سفاکی و خونریزی سے دنیا کو تباہ کیا - دونوں کی عمر اسی دھن میں ختم ہوئی مگر انجام کچھ نکلا - ایک آقا کے دو نوکر ہوں ایک فرمانبردار اور خدمت گذار - دوسرا گستاخ اور نافرمان آقا ایک عرصہ کے بعد دونوں کو بغیر معاوضہ دیے برطرف کر دے تو کیا اس کا یہ فعل دانشمندانہ تصور ہوگا؟ جنگل میں ایک ڈاکو مسافر پر حملہ آور ہوتا ہے مسافر اپنا بچاؤ کرتا ہے - دونوں ریوالور نکالتے ہیں اور ایکدوسرے پر یکدم فایر کرتے ہیں - دونوں مر جاتے ہیں - کیا ان دونوں کا فعل یکساں ہے کہ دونوں کو ایک ہی انجام تک پہنچایا یعنے ہمیشہ کے لئے فنا کر دیا - قدرت کے اور کاموں کو دیکھو وہ ہمیشہ فعل کا نتیجہ پیدا کرنے میں بڑی جزورس اور سخت گیر ثابت ہوتی ہے - بچہ نادانی سے آگ میں ہاتھ ڈال دیتا ہے - قدرت اس کی نادانی پر ترس نہیں کھاتی - جو انگلی آگ کو پوری طرح چھو جاتی ہے جل جاتی ہے پاس والی جھلس جاتی ہے اس کے ساتھ والی میں جلن ہونے لگتی ہے - کام کی تمام مقدار دیکھی گئی ہے اور سب قسم کے تفاوت پر مناسب حال نتیجہ مرتب ہوا ہے مگر ظالم ڈاکو اور بیگناہ مسافر کے کام میں زمین و آسمان کا تفاوت دیکھ کر بھی نتیجہ یکساں دیا گیا ہے - حملہ آور ایک شخص کو زخمی کرتا ہے ڈاکٹر مرہم لگا کر زخم کو مہلک ہونے سے روک دیتا ہے - حاکم وقت حملہ آور کو سزا دیتا ہے اور ڈاکٹر کو انعام - حاکم کا طرز عمل عاقلانہ اور منصفانہ ہے - مگر ایسے ایسے نیکی اور بدی کے ہزارہا مختلف کام کرنے والوں کے لئے مرجانے کا قانون جو ایسے بڑے پُرحکمت کارخانہ کے مالک نے جاری کیا ہے یا تو اُس کا یہ مل کیا جائے کہ دنیا کا بنانے والا بنانے کے وقت بہت بڑا عقیل تھا مگر موت کا قانون جاری کرنے کے وقت وہ معاذ اللہ خاکم بدہن دیوانہ ہو گیا ہے اور ہزارہا سال کے اندر تیار کیا ہوا گھروندا بچوں کی طرح اپنے ہاتھ سے برباد کرنے پر تُل گیا ہے - یا پھر یوں کہیں کہ اس کارخانہ کا کام مرنے پر ختم نہیں ہوتا -

نظام شمسی کے تمام حصے یعنے زمین اور سیارے قرن ہائے دراز کے بعد گیس کی حالت سے سیال اور سیال سے منجمد اور پھر قرن ہائے دراز کے بعد گرم سے سرد ہوئے ہیں تو اس کام کا نتیجہ سبزہ و گل کی صورت میں نمودار ہوا ہے اور پھر ایسے ہی بڑے عرصہ کے بعد یہ حیوانی اور انسانی خلوق بتدریج سٹیج پر آئی ہے اور اپنا اپنا پارٹ کرنے لگی ہے - ان تمام بڑے بڑے انقلابوں کو دیکھنے والا کوئی ذی عقل و شعور انسان موجود ہوتا تو روشن گیس کو سیال ہوتے دیکھ کر گھبراتا اور سمجھتا کہ وہ نورانی کرہ تباہ ہو گیا - اسی طرح سیال کو منجمد اور گرم کو سرد دیکھ کر بھی وہ خائف ہوتا اور مزید تباہی کا گمان کرتا مگر حقیقت اس خیال کے خلاف ہوتی اور جسے وہ تباہی سمجھا ہے اگر

زندہ رہتا تو دیکھ لیتا کہ کیسی خوشنما آبادی میں تبدیل ہوئی ہے تو کیا آجکل کے فلاسفر جو ایسی بڑی بڑی عظمت و شان رکھنے والی جاندار ہستیوں کے مرجانے پر یقین کر لیتے ہیں کہ ان کے کارہائے نمایاں سب برباد گئے اور وہ ہمیشہ کیلئے فنا اور نابود ہو گئیں کیا یہ لوگ اسی کج فہمی اور ناعاقبت اندیشی کے مجرم نہیں ہیں؟ اور کیا وہ تمام گزشتہ انقلابوں کا نتیجہ دیکھنے کے باوجود یہ خیال قائم نہیں کر سکتے کہ اسوقت کا مرنا اور فنا ہونا بھی ایک پارٹ ہے جس کے بعد اسی قدر عرصے کے اندر کوئی اور عالم آباد ہوگا اور وہاں یہاں کے تمام اعمال و افعال کے پائدار اور مستقل نتیجے بروئے کار لائے جائینگے اور معلوم ہوگا کہ جس حکمت سے اس کارخانہ کی بنیاد رکھی گئی ہے اسی حکمت سے اسے آخری شکل تک پہونچایا گیا ہے

اب مضمون نگار اور اگست کا پرچہ ملاحظہ کرنے والے حضرات ارشاد فرمائیں کہ آیا یہ خیال قلب کو تسکین دے سکتا ہے کہ جس مہربان عزیز کو قدرت نے زمین آسمان کی تمام نعمتیں مہیا کرنے کے بعد اپنی نیز یہ دعوت کیا ہے اسی کے ساتھ بظاہر دوستی اور درپردہ دشمنی کا برتاؤ روا رکھا ہے یعنے دنیا کی اور دیگر مخلوق کے حالات کا اثر اور ان کے ہر کام کا نتیجہ پورے کانٹے کی تول دینے کا قانون بنایا ہے مگر اس اشرف المخلوقات کے ساتھ یہ سلوک ہوا ہے کہ اسکی تمام عمر اعمال خیر میں بسر ہو یا زندگی و ہوشیاری میں ہر حال کے اندر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے اور بس یہ خیال صحیح ہو تو دنیا کا بنانے والا دیوانہ ہی نہیں بے مروت اور ظالم بھی ثابت ہوتا ہے کہ بدکو سزا اور نیک کو انعام دینا ایک طرف اس نے انسان کے اندر پاک اور ناپاک جذبات اور نیکی اور بدی کی تمیز پیدا کرنے کے بعد یہ ستم ظریفی بھی روا رکھی ہو کہ ناپاک انسان کی تمام عمر ناز و نعمت میں بسر کروائی اور پاکباز اپنی زندگی کو جائز حدود کے اندر محدود رکھنے اور اعمال خیر بجا لانے میں ہر گونہ تکلیفیں برداشت کرتا رہا۔ تو جب دنیا میں صرف یہی نتیجہ ہے اور عاقبت کی طرف سے یاس ہے تو کیا اس تمیوری کے علمبردار اخلاقی خوبیوں کو بے نتیجہ سمجھکر لوگوں کو نیکوکاری سے مجتنب اور بدراہی پر گامزن ہونے کا مشورہ دیں گے کہ کچھ لذت و راحت ہے تو اس میں ہے۔ اور تمام رستے یہاں زحمت رساں ہیں اور وہاں ہیچ۔ کیا یہ خیال نظام قدرت کی تمام رفتار کے مطابق معلوم ہوتا ہے؟ یا یہ نہیں تو کیا پھر نظام قدرت کو ایسا وسیع تصور نہیں کر سکتے؟ کہ گزشتہ انقلابوں کی طرح اس میں اور ایک یا چند انقلابوں کی بھی گنجایش ہو جن کے اندر مسافر موت کے پل کو عبور کر کے اپنی منزل مقصود تک پہونچے اور معلوم ہو کہ جس طرح دنیا کا کوئی ذرہ اور اہل دنیا کا کوئی جذبہ اور عادت بے مصرف نہیں ہے اسی طرح انسان کے اخلاقی جذبات بھی بہت بڑے مدعا کو پیش نظر رکھ کر پیدا کئے گئے ہیں اور جس طرح ہر چھوٹی چیز اور چھوٹے کام کا نتیجہ جلدی پیدا ہوتا ہے اور بڑی چیزوں اور بڑے کاموں کا نسبتہً دیر میں اسی طرح اس سب سے اعلیٰ اور اشرف ہستی کے اعمال کا نتیجہ بھی اپنے وقت معین پر ظہور پائے گا اور قدرت خداوندی کی حکمت و عظمت کو ظاہر کرے گا۔

اس گزارش میں غور کرنے والوں کو یہ اطمینان رکھنا چاہئے کہ دنیا کے اندر آئندہ انقلاب ہونے کا صرف گمان

ہی نہیں ہے۔ اس کے قرائن و علامات بھی موجود ہیں۔ اول تو یہ تمام نظام ہر لمحہ تغیر پذیر ہے تو اس کی موجودہ صورت ایک حال پر کب رہ سکتی ہے۔ دوسرے سائنس کی آنکھ دیکھتی ہے کہ آفتاب کی حرارت کم ہو رہی ہے۔ زمین اور آفتاب کا درمیانی فاصلہ بھی کم ہو رہا ہے۔ آپ آفتاب کے اندر ریڈیم جیسی ہزار چیزیں تصور کریں جس انجام تک پہونچنے کے لئے آفتاب کے اجزا پیہم حرکت کر رہے ہیں اس کا ظہور دور نہیں اور ایک دن چونکہ آنے والا ہے اس لئے قریب ہے جبکہ نظام شمسی کے تمام ارکان سرد ہو کر اور ایک دوسرے سے پیوستہ ہو کر برف کا ایک تودہ بنجائیں گے جو زمین کے قطب شمالی سے زیادہ سرد ہوگا اور پھر جس طرح پہلے زمین سرد ہو کر اور باہر سے آفتاب کی حرارت لیکر حرارت کی مقدار اور اپنی استعداد کی حد تک آراستہ اور آباد ہوئی ہے اسی طرح اس تودۂ برف کے باہر اگر کوئی اور بڑا آفتاب ہوگا تو اس کی روشنی اور حرارت سے اسوقت سے زیادہ خوبصورت اور عجیب آبادی ظہور میں آئے گی۔ لیکن دوسرا آفتاب بھی اگر جسمانی ہوگا تو ضرور محدود ہوگا اور اس کی قوت بھی ایک دن جواب دے گی۔ ایسے کئی آفتاب مان لو جب بھی محدود قوت رکھنے والے آفتاب اور محدود حرارت سے پیدا ہونے والی آبادی سب کچھ ایک نہ ایک دن ختم ہو کر رہیں گے۔ ان تمام انقلابوں کے بعد اگر ان کے علاوہ کوئی جسم سے پاک۔ سراپا نور اور غیر محدود آفتاب وحدت بھی موجود ہے تو اس کا غیر فانی نور جو اسوقت اس جسمانی آفتاب کے تاریک آئینہ میں سے ہو کر جلوہ گر ہوتا ہے اُسوقت براہ راست اور بلا واسطہ روشنی ڈال کر اس منجمد برفانی کرہ میں پھر آراستگی اور زندگی کی ایسی لہریں دوڑائے گا کہ سب گزشتہ اجسام اور سب گزشتہ ارواح کوئی اس کے نور سے محروم نہ رہیگا۔ دنیا کے آفتاب فانی ہیں اُن کے نور سے پیدا ہونے والی آبادی بھی فانی ہے۔ اُس دائمی اور سرمدی آفتاب کے براہ راست چمکنے سے جو آبادی پیدا ہوگی وہ دائمی اور ابدی ہوگی۔ دنیا کے آفتاب نقص سے کمال کی طرف اور کمال سے زوال کی طرف جا رہے ہیں، ان سے پیدا ہونے والی ہستیاں بھی نقص سے کمال اور کمال سے زوال کی طرف جانے کا جھولا جھول رہی ہیں۔ وہ نور کامل اور اکمل ہے اُس کی روشنی دفعتہً اور ایک کُن کے اشارہ سے وہ مکمل ہستیاں پیدا کرے گی جن کے تمام حالات اور صفات مکمل اور لازوال ہوں گے۔ ان کی راحت بھی دائمی اُن کا رنج بھی دائمی "ہم فیہا خالدون"[1] وہ وقت ہے جسے قیامت کہتے ہیں اور وہی وقت ہے جبکہ حیات بعد الموت کا جلوہ نظر آئے گا۔ آپریشن

---

[1] بات سے بات نکلتی ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدائے لایزال کو مان کر مادہ کو قدیم ماننے میں کیا قباحت ہے اور مادہ کو فنیت سے بہت یقین کرنے کی کیا صورت ہے اور جو چیز ازلی نہ ہو اُس کے ابدی ہونے کا ثبوت کیا۔ مجال سخن تنگ نہیں ہے اور ہر نکتہ پر تفصیلی بحث ہو سکتی ہے سردست دیکھنا یہ ہے کہ جو کچھ تحریر میں آیا اس پر کیا شکوک وارد ہوتے ہیں۔ جہاں تک رستہ نظر آیا ہے اس کے خس و خاشاک کو دور کرنے کے بعد رفتار کو جاری رکھنا مناسب ہوگا۔

کے وقت چند رگوں اور نسوں کی حرکت و سکون کا تماشا دیکھنے والے ڈاکٹر اپنے معلومات پر کتنا ہی فخر کریں قدرت خداوندی کے رازوں کو اپنی محدود عقل سے قبل از وقت دریافت نہیں کر سکتے۔ ہاں عقل سلیم سے کام لیں اور تمام کائنات کا اول سے آخر تک تجزیہ اور تقسیم کریں اُس کے ہر جزو کو نظر غایر سے دیکھیں تو ایسے آپریشن کے بعد البتہ قرائن و علامات دریافت کر سکتے اور خشیۃ ربانی کو دل میں جگہ دے سکتے ہیں۔ "انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء"

(۱) قیامت کا یہ وقت ہے جس کی خبر دیتے ہوئے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے "اشرقت الارض بنور ربہا" یعنے وہ وقت ہے جبکہ زمین اپنے پروردگار کے نور سے براہ راست روشن ہوگی۔

(۲) جو سوال غور کرنے کے لئے اس تحریر کے اندر پیش ہوا ہے وہ قرآن کریم میں خدا کی طرف سے پیش کیا گیا ہے "افحسبتم انما خلقناکم عبثاً وانکم الینا لا ترجعون" کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو عبث پیدا کیا اور تم ہمارے پاس واپس نہ آؤ گے۔

(۳) پھر قرآن ہی میں اس سوال کا حل سوچنے کے لئے اپنے بندوں کو تدبیر بتائی ہے اور جواب کی طرف رہنمائی کی ہے تو ارشاد ہوا ہے:۔

اِنَّ فی خلق السمٰوات والارض واختلاف اللیل والنہار لآیات لاولی الالباب الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبہم ویتفکرون فی خلق السمٰوات والارض ط ربنا ما خلقت ہذا باطلاً ط سبحانک فقنا عذاب النار ۵	بیشک آسمان و زمین کی پیدائش میں اور شب و روز کی آمد رفت میں اُن داناؤں کے لئے نشانات قدرت ہیں جو اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوئے اللہ کو یاد رکھتے ہیں اور آسمان و زمین کی تخلیق میں غور کرتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ پروردگار تو نے یہ سب کچھ رائگاں نہیں بنایا تو پاک و تقدس ہے ہمیں عذاب جہنم سے محفوظ رکھ۔

قرآن کریم میں ہر جاہل و عالم اور عامی و عارف کو ہدایت دینے کا سامان مہیا ہوا ہے۔ حیات بعد الموت کا مسئلہ حل کرنے کے لئے اہل علم کے سامنے مذکورۂ بالا سوال پیش کیا ہے اور جواب کے لئے راستہ دکھایا ہے تو جو لوگ علم کی روشنی سے محروم ہیں اور مناظر قدرت کو دیکھنے اور سمجھنے کی استعداد نہیں رکھتے۔ انھیں نہایت سادہ طریق پر غور کرنے کی دعوت دی ہے اور ارشاد کیا ہے کہ تم دنیا کے واقعات سے تم صحیح نتائج اخذ نہیں کر سکتے تو صرف اپنے عقیدہ اور خیال کا ہی نتیجہ دیکھو اور غور کرو کہ اگر خدا کا وجود نہ ہو اور جزا و سزا کا اندیشہ نہ ہو تو منکرین خدا بیشک راہ راست پر ہوں گے مگر ایسی راستی کا جو نتیجہ ہے اُس نتیجہ سے خدا کو ماننے والے بھی خود بخود پہونچ جائیں گے اور موت کے بعد جواب دہی سے آزاد ہونے میں منکرین کے برابر ہوں گے نہ منکرین کا کوئی فائدہ نہ مومنین کا کوئی نقصان۔ لیکن اگر مومنین خدا کو ماننے میں سچے ہیں اور اس کے حضور میں پیش ہو کر جواب دہی کے لئے تیار ہیں تو اس عقیدے کے

صحیح ہونے کا نتیجہ مومنین کے حق میں موت کے بعد سراپا راحت۔ دائمی نعمت اور غیر فانی مسرت ہے اور منکرین کے لئے ایسا ہی دائمی اور غیر فانی رنج و عذاب اندریں حالات مومنین ہر طرح محفوظ اور مامون ہیں انھیں اپنا مسلک بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ منکرین کو غور کرنا چاہیئے کہ آیا وہ اپنی بہتری کے لئے وہ راستہ اختیار کریں جو غلط ہو یا صحیح ہر صورت میں پر امن ہے یا ایسے راستہ پر گامزن ہوں جو اگر غلط ہوا تو ہر گونہ بلا میں مبتلا کریگا۔ یہ استدلال بھی صحیح ہے اور اکثر طبائع کو اطمینان دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اپنی ذاتی تحقیق پر مدار رکھنے والے اس سے تسکین نہ پائیں تو انکے لئے دوسری سبیل موجود ہے۔ نظام عالم کو دیکھیں اور غور کریں۔ قرآن کریم میں اس استدلال کا ذکر ہے الفاظ ہے:۔
"ان یک کاذبا فعلیہ کذبہ وان یک صادقا یصبکم بعض الذی یعدکم" اگر وہ غلط کہتا ہے تو وہ جانے اور اس کی غلط بیانی اور اگر وہ سچ کہتا ہے تو اے منکرین تم کو وہ سب عذاب نہ ہوں جو وہ کہتا ہے جب بھی کچھ نہ کچھ تکلیف ضرور ہوگی۔

(پروفیسر) محمود علی (رنڈھیر کالج)

(نگار) خدا کے وجود اور بقاء روح کے متعلق ہمارے فاضل دوست پروفیسر محمود علی صاحب نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے، وہ کوئی نئی چیز نہیں۔ اہل مذاہب کی طرف سے ہمیشہ یہی کہا گیا ہے اور اس سے زیادہ عقل آرائی کی اُمید ان سے ہو بھی نہیں سکتی لیکن کبھی اس کا کوئی اثر اہل علم پر نہیں ہوا۔ تاہم میں نے اس مقالہ کو صرف اس لئے درج کر دیا ہے کہ فریق ثانی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ میں ان کے خیالات کی اشاعت نہیں کرتا۔ امید ہے کہ ڈاکٹر محمد نصیر الدین صاحب جن کے مضمون پر یہ ایراد کیا گیا ہے اس کا جواب دینے کی زحمت گوارا فرمائیں گے

تذکرۂ شعر سخن

یہ تذکرہ اُردو زبان میں اپنی نوعیت کا پہلا تذکرہ ہے جس میں زمانۂ قدیم سے لیکر موجودہ عہد تک کے تمام مشہور شعراء فارسی و اُردو کے کلام پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں معہ جواب و محاکمہ یکجا کر دئے گئے ہیں۔ فن شعر و انشاء کے شایقین کے لئے عجیب چیز ہے۔ قیمت محصول ۸/ع

منیجر نگار لکھنؤ

(بقیہ ملاحظات)

عبداللہ گاندھی کا ارتداد مجھے کسقدر خوشی ہوئی جسوقت میں نے یہ خبر پڑھی کہ گاندھی جی کے بیٹے کی پسر شدھی ہوگئی اور وہ ترکِ اسلام کرکے پھر اسی ماحول میں چلے گئے جہاں اسوقت تک ان کے گوشت و پوست کی نشوونما ہوئی تھی۔

پھر میری یہ مسرت اس لئے نہیں ہے کہ ایک معمولی کیرکٹر کا انسان دایرۂ اسلام سے نکل کر مسلمانوں کی جماعت کو اپنے وجود سے پاک کرگیا اور نہ اس لئے کہ ان کے والدین کو اپنا یوسفِ گم گشتہ پاکر غیر معمولی راحت و مسرت حاصل ہوئی بلکہ صرف اس لئے کہ مسلمانوں کو ان کے پیچھورے پن کی یہی سزا ملنی چاہئے تھی۔

یوں تو مسلم اخباروں میں روز ہی ہزاروں سجدۂ شکرانہ کے ساتھ دایرۂ اسلام میں داخل ہونے والوں کا ذکر ہوتا رہتا ہے لیکن جب کوئی ممتاز و نمایاں شخص اسلام قبول کرتا ہے تو پھر ان کی تنگ ظرفی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دولت بے اندازہ انھیں حاصل ہوگئی ہے اور یہ معجزۂ اسلام اب ضم آباد ہندوستان کو یزدان پرست بنائے بغیر نہ رہے گا۔ تہنیت کے جلسے ہوتے ہیں، اللہ اکبر کے نعرے بلند کئے جاتے ہیں اور ان کی خوشی کا وہی عالم ہوتا ہے جو ایک بچہ کا مٹی کا کھلونا پانے کے بعد ہوسکتا ہے

اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا وہ وقار ہے جو کونین کی دولت حاصل کرنے کے بعد بھی ایک مجسمہ کوہ پیکر کی طرح اپنی جگہ قائم رہتا ہے اور دنیا کی کوئی چیز [redacted] اس شرف میں اضافہ نہیں کرسکتی جس کا تعلق صرف صداقت اخلاق، بلندی سیرت سے ہے۔ اس نے بڑی بڑی ہستیوں کو بھی اپنے سے وابستہ دیکھ کر کبھی اظہار فخر و مباہات نہیں کیا اور عظیم الشان سلطنتیں حاصل کرنے کے بعد بھی اترانا اپنا شعار نہیں بنایا۔ اس نے اپنے برکات دنیا کے سامنے پیش کئے اس لئے نہیں کہ وہ دنیا کا محتاج تھا بلکہ اسلئے کہ دنیا اس کی محتاج تھی۔

پھر کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ جنھوں نے تاج کیانی و کلاہ خسروانی کو بھی اپنے سامنے جھکتے ہوئے دیکھ کر اپنی متانت و سنجیدگی کو نہیں کھویا، آج ان کے اخلاق کی تنگ ظرفی اور چھچھورے پن کا یہ عالم ہے کہ گاندھی جی کا بیٹا دکھی حیثیت سے بھی قابل ذکر نہیں ہے مسلمان ہوتا ہے اور یہ رقص کرنے لگتے ہیں۔ گویا ایک معمولی انسان اسلام قبول کرتا ہے اور یہ بے اختیار بچوں کی طرح ناچنے لگتے ہیں۔

اگر کسی کا اسلام قبول کرلینا واقعی باعث مسرت امر ہے تو اس کا تعلق صرف اخلاق سے ہے اور

اس میں گاندھی کے بیٹے اور میکو اچمار کے پرتے کا امتیاز کوئی معنی نہ رکھتا، لیکن اگر یہ مسرت اس لئے ہے کہ مسلمان ہونے والا کونسل کا ممبر ہے، یا بمبئی کا سیٹھ ہے تو اس کا تعلق یقیناً مذہب سے نہیں بلکہ اس ذلیل جذبہ سے ہے جسے اکابر اسلام نے ہمیشہ ٹھکرایا اور جو اب بدقسمتی سے ہمارا تنہا ذریعۂ افتخار بنا ہوا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ مسلم صحافت اس واقعہ کو کس نقطۂ نگاہ سے دیکھے گی اور اس اسلام لاکر مرتد ہو جانے والے گاندھی کے بیٹے کو کن الفاظ سے یاد کرے گی لیکن میرا مشورہ یہی ہے کہ اس باب میں بالکل سکوت اختیار کیا جائے اور عبداللہ گاندھی کو برا بھلا کہہ کر اپنی تنگ ظرفی پر کوئی اور مہر توثیق ثبت نہ کی جائے۔

اگر عبداللہ گاندھی کا اسلام قبول کرنا صرف اس بنا پر تھا کہ وہ مسلمانوں کے اخلاق کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے (جیسا کہ انھوں نے ظاہر کیا ہے) تو ان کو قدرتاً یہ حق بھی حاصل تھا کہ جب مزاج میں آئے وہ ترکِ اسلام کر دیں اگر اس میں کوئی چیز ان کی "رعایتِ شوق" کے لئے موجود نہ تھی۔ اگر مسلمانوں نے اُن کے اسلام لانے پر غیر معمولی اظہار مسرت کیا تھا تو اچھا نہ کیا تھا اور اب اگر ان کے ارتداد پر برا کہیں گے تو اور زیادہ برا کریں گے

تاجدارِ دکن کی غیر معمولی بلند نظری

اعلیحضرت خسروِ دکن کی تقریبِ جوبلی کا چرچا دو سال سے ہر جگہ ہو رہا تھا اور اس دوران میں جو اعلانات وقتاً فوقتاً اخباروں میں شایع ہوئے اُن سے معلوم ہوتا تھا کہ اس سلسلہ میں لطف و تفریح کے لئے دولت بے اندازہ خرچ کیجائیگی لیکن اب تازہ فرمان خسروی نے ثابت کر دیا کہ تاجدار دکن کا نقطۂ نظر دنیا کے زاویۂ نگاہ سے کتنا مختلف ہے اور ٹھیک اسی وقت جبکہ عام طور پر ذہن انسانی صرف سطح و قشر کو دیکھتی رہتی ہے اعلیحضرت کا غیر معمولی دل و دماغ کسقدر گہرائیوں میں ہے۔

دنیاوی دولت و ثروت کا وہ کونسا مظاہرہ ہے جو شاہِ دکن کی نگاہوں سے نہ گزرا ہو، نمایش جاہ و حشم کا وہ کونسا پہلو ہے جو آصف جاہ سابع کے لئے نئی چیز ہو۔ جس نے زر و جواہر کے انبار میں آنکھ کھولی ہو، جس نے اپنا عہد طفلی لعل و گہر سے خذف ریزوں کی طرح کھیلنے میں بسر کیا ہو، جس کا دورِ شباب تمام امکانی فردوس سامانیوں کے ساتھ بسر ہوا ہو، جو اپنی دولت کے لحاظ سے اس عہد کا سب سے بڑا شخص تسلیم کیا جاتا ہو اور جس کو خدا نے لاکھوں نفوس پر حکمرانی کرنے کا اختیار تفویض کر دیا ہو، ظاہر ہے کہ اس کا جذبۂ مسرت زر و دولت کی کمیر سے کیا پورا ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے تو کوئی ایسی چیز ہونی چاہئے جو اس دنیا میں نایاب ہو، کوئی ایسی بات ہونا چاہئے جو عامۃ الورود نہ ہو ــــ اور ــــ حقیقت یہ ہے کہ اس طرف اگر خیال انسانی منتقل ہو سکتا تھا تو وہ سوائے خسرو دکن کے کسی اور کے دماغ میں آ بھی نہ سکتا تھا۔

تاریخ عالم اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت تک دنیا میں کوئی ایک فرمانروا بھی ایسا نہیں گزرا ہے